جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ ترجمان القرآن

۱۹۹۴

مُدیر: خرّم مُراد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۰ | مئی ۱۹۹۴ ذیقعدہ ۱۴۱۴ | عدد ۵

فہرست مضامین

برائے اداراتی امور

منصورہ' ملتان روڈ' لاہور ۵۴۵۷۰' فون نمبر ۸-۷۵۷۰۱۳۴ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۳۷۱۹

برائے انتظامی امور

رحمن مارکیٹ' اردو بازار' لاہور ۵۴۰۰۰' فون نمبر ۷۲۳۴۰۱۳-۷۲۳۶۹۶۵' پوسٹ بکس نمبر: ۱۳۴۳

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ کراس چیکس قابل وصول نہ ہوں گے۔

قیمت فی شمارہ-/۱۰ روپے ○ زر سالانہ: ۱۰۰ روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک' خلیجی امارات و برصغیر: ۵۰۰ روپے' یورپ: ۶۰۰ روپے' امریکہ و آسٹریلیا: ۷۰۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز' لاہور سے چھپوا کر دفتر' ترجمان القرآن' اچھرہ' لاہور سے شائع کیا۔

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اچھرہ لاہور (پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پروفیسر خورشید احمد

ریاست جموں و کشمیر پر ہندوستان کے غاصبانہ قبضے کے خلاف چلنے والی تحریک آج ایک بڑے ہی نازک اور فیصلہ کُن دَور میں داخل ہو گئی ہے۔ تحریکِ آزادیِ کشمیر کوئی نئی تحریک نہیں۔ اس کا آغاز ۱۹۳۱ میں ڈوگرہ راج کے خلاف عوامی جدوجہد سے ہوا۔ ۱۹۴۷ میں یہ تحریک ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ ہندوستان نے ڈوگرہ مہاراجہ اور برطانوی سامراج کے، اور خصوصیت سے اس کے نمائندوں ریڈکلف اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے تعاون سے، اور ننگی فوجی قوت کے ذریعے، ریاست کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ پھر جب عوامی جدوجہد کا دباؤ بڑھا تو ہندوستان نے اقوامِ متحدہ کا سہارا لیا اور استصواب کا وعدہ کر کے جنگ بندی کرائی۔ لیکن آج تک ریاست کے شہریوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے حق سے محروم رکھا۔

ریاست کے مسلمان ایک مدت تک یہ امید لگائے رہے کہ ان کی قسمت کا فیصلہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہو جائے گا۔ انھیں یہ امید بھی تھی کہ بڑی طاقتیں اور پاکستان ان قراردادوں پر عمل در آمد کو یقینی بنائیں گے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی جنگوں سے بھی ان کو یہ توقع تھی کہ شاید کشمیر کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے۔ لیکن ان تمام امکانات سے مایوس ہو کر مقبوضہ جموں و کشمیر کے مسلمانوں نے ایک آخری کوشش مسلم متحدہ محاذ کے جھنڈے تلے ۱۹۸۷ کے انتخاب کے ذریعے کی۔ اس انتخاب میں جس درجے کی دھاندلی ہوئی اس نے بیلٹ بکس کے ذریعے تبدیلی کے امکان سے عوام کو مکمل طور پر مایوس کر دیا، جس کا اظہار ۱۹۸۹ کے انتخابات کے مکمل بائیکاٹ کی شکل میں کیا گیا۔ اس انتخاب کا ۹۷ فیصدی افراد نے بائیکاٹ کیا، جو ایک طرف ہندوستان کے غاصبانہ اقتدار کے خلاف ایک ریفرنڈم تھا اور دوسری طرف

تحریک کی حکمتِ عملی میں ایک انقلابی تبدیلی کے لیے فیصلہ کن موڑ بن گیا۔ اب بیلٹ کی بجائے بلٹ (گولی) کے ذریعے مزاحمت کا راستہ اختیار کیا گیا۔ ۱۹۹۰ سے جموں و کشمیر کے مسلمانوں نے ہندوستان کے استعماری چنگل سے آزادی کے لیے وہی راستہ اختیار کیا ہوا ہے جسے الجزائر میں مسلمان عوام نے ۱۹۶۰ کی دہائی میں فرانس کے سامراج کے خلاف استعمال کیا تھا اور جو اس وقت سے استعماری طاقتوں کے خلاف آزادی کی تحریک کا مؤثر ترین ہتھیار رہا ہے۔

آج اگر مسئلہ کشمیر اجاگر ہوا ہے' اور اسے عالمی پیمانے پر ایک بار پھر شنوائی حاصل ہو رہی ہے' تو یہ اس جہادی تحریک کی وجہ سے ہے جو اہلِ کشمیر نے اپنے حقِ آزادی کے حصول کے لیے برپا کی ہوئی ہے۔ گذشتہ چار سال سے کشمیر کے نوجوان اپنے خون کا نذرانہ پیش کر کے جہادِ آزادی کی ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ موجودہ مرحلے کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ مسلمانانِ کشمیر کی ہمہ گیر جہادی تحریک نے مقبوضہ کشمیر کے طول و عرض میں ہندوستان کے اقتدار کی چولیں ہلا دی ہیں اور چند ہزار سرفروشوں کی جدوجہد نے ہندوستان کی ۶ لاکھ فوج کو ریاست پر ہندوستان کی حکمرانی کو قائم رکھنے میں ناکام کر دیا ہے۔ اس تحریک کو کچلنے کے لیے ہندوستان نے اپنی عسکری قوت کا بڑا حصہ کشمیر میں جھونک دیا ہے' ظلم اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے' ریاستی تشدد کا دور دورہ ہے' انسانی حقوق ہر گلی اور ہر بازار میں پامال ہو رہے ہیں' بوڑھے' بچے' عورتیں نشانۂ ستم بن رہے ہیں' علاقے کے علاقے ایسے ہیں جہاں ۱۲ مہینے کرفیو کا راج رہتا ہے' گاؤں کے گاؤں اور محلے کے محلے نذرِ آتش کیے جا رہے ہیں' معصوم عورتوں کی آبروریزی بلکہ اجتماعی عصمت دری ریاستی ظلم کا ایک گھناؤنا اسلوب بن گئی ہے' لیکن ظلم کا تازیانہ تحریکِ آزادی کے لیے مہمیز کا کام کر رہا ہے۔

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد

آج جب کشمیر کے عوام اپنے خون کی زبان سے ہندوستان کے ظالمانہ سامراج سے آزادی اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق مانگ رہے ہیں' اور اس کے لیے بے مثال قربانیاں پیش کر رہے ہیں' سوچنے کا اہم سوال یہ ہے کہ پاکستان' اس کے عوام اور حکومت کہاں تک اپنا فرض ادا کرنے کے لیے تیار ہیں؟ ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ مسئلہ کے تاریخی تناظر اور مستقبل کے امکانات کی روشنی میں اس سوال پر غور کرے' اللہ رب العزت اور مسلمانانِ جموں و کشمیر کے سامنے اپنی تاریخی جواب دہی کو سمجھے' اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائے۔ تاریخ میں

ایسے فیصلہ کن مواقع روز روز نہیں آتے۔ اگر ہماری غفلت سے یہ تاریخی موقع ضائع ہو گیا تو بہ حیثیت قوم ہمارے لیے دنیا میں تباہی اور آخرت میں رسوائی کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ اور اگر ہم نے وقت کے اس چیلنج کا بھرپور جواب دیا تو ان شاء اللہ برصغیر کا نقشہ بدل جائے گا۔

سب سے پہلے جس بات کو واضح ہو جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا مسئلہ دراصل خود پاکستان اور اہلِ پاکستان کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔ بلاشبہ ظلم جہاں بھی ہو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھائے اور مظلوم کی مدد کرے۔ اور اگر یہ ظلم اس کے اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں پر ہو رہا ہو تو اس کا فرض ہے کہ اور بھی ہمت اور مستعدی کے ساتھ مظلوموں اور مستضعفین کی مدد کرے۔ اور اگر یہ آگ خود اس کے اپنے گھر میں لگی ہو اور اس کے اپنے جگر گوشے مشقِ ستم بن رہے ہوں تو پھر اس کی ذمہ داری اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کشمیر میں آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں اہلِ پاکستان کی ذمہ داری ہر تین پہلوؤں سے ہے۔

کشمیر' جیسا کہ قائداعظمؒ نے فرمایا' ہماری اپنی شہ رگ ہے۔ ایک قوم کے لیے اس سے بڑی غفلت کون سی ہو سکتی ہے کہ اس کی شہ رگ پر دشمن کا قبضہ ہو اور اسے پھر بھی چین کی نیند آتی ہو؟

مسئلہ کشمیر کے بارے میں دوسری حقیقت یہ سامنے رہنی چاہیے کہ پاکستان کی حیثیت اس معاملے میں ایک بنیادی فریق کی ہے' محض ایک تماشائی کی نہیں! کشمیر کا سب سے پہلا قانونی رشتہ پاکستان سے قائم ہوا۔ آزادی کے حصول کے ساتھ ۱۴ اگست کو ریاست جموں و کشمیر اور پاکستان کے درمیان ایک عبوری معاہدہ (stand still agreement) ہوا' جس کی رو سے وہ تمام امور' خصوصیت سے راہ داری' مواصلات' ڈاک' بجلی وغیرہ جو پہلے سرکارِ برطانیہ کے ذریعے انجام پاتے تھے' اس معاہدہ کے بعد پاکستان کے ذریعے انجام پانے لگے۔ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو جس طرح پاکستان کی عمارتوں پر پاکستانی پرچم لہرایا اسی طرح کشمیر کے ان محکموں پر بھی پاکستانی پرچم بلند ہوا اور وہاں کے سرکاری ملازمین نے پاکستان سے وفاداری کا رشتہ استوار کیا۔ اس انتظام پر ضرب ہندوستان کی فوج کشی سے پڑی اور تنازعہ کشمیر نے جنم لیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان اور ہندوستان کی افواج میں سرزمینِ کشمیر پر جنگ ہوئی۔ بالآخر اقوام متحدہ نے استصواب کے وعدے پر جنگ

بندی کرائی۔ جنگ بندی کی یہ قرارداد (ریزولیوشن ۴۷ آف ۱۹۴۸) بلیجیئم' چین' کولمبیا' کینیڈا' برطانیہ اور امریکہ نے مشترکہ طور پر پیش کی اور پاکستان اور ہندوستان نے اسے منظور کیا۔

اس پس منظر کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کے چار فریق ہیں۔ پاکستان' ہندوستان' اقوامِ متحدہ اور سب سے اہم ریاست جموں و کشمیر کے عوام جنھیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ نہ یہ مسئلہ محض ہندوستان کا داخلی مسئلہ ہے اور نہ ہی اس کا تعلق محض پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کسی سرحدی تنازعے سے ہے۔ اصل مسئلہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا ہے جسے اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں وہاں کے عوام کو اپنی آزاد مرضی اور بین الاقوامی نگرانی میں منعقد کیے جانے والے استصواب کے ذریعے طے کرنا ہے۔ یہ ان کا حق ہے کہ وہ طے کریں کہ ان کی ریاست کا الحاق پاکستان سے ہو یا ہندوستان سے' نیز اس الحاق کے بعد وہاں کا مستقل نظامِ حکومت کس شکل میں اور کس انداز میں مرتب کیا جائے۔ اصل مسئلہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے وعدوں کے مطابق حقِ خودارادیت کا مسئلہ ہے۔ اور جب تک اس مسئلے کو حل نہیں کیا جاتا' کشمیر کا مسئلہ پیچیدہ تر ہوتا جائے گا۔ جس اسکیم پر برصغیر پاک و ہند کو آزادی ملی اور دو مملکتیں وجود میں آئیں یہ اسی اسکیم اور اسی ایجنڈے کا ایک غیر طے شدہ نقطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استصواب سے ہٹ کر اس کا کوئی قانونی' سیاسی اور اخلاقی حل ممکن نہیں۔

مندرجہ بالا گزارشات کی روشنی میں یہ بات بھی آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر ہندوستان کا حصہ نہیں بلکہ ایک متنازعہ علاقہ ہے' جس کے مستقبل کا فیصلہ بین الاقوامی قانون کے مطابق ہونا باقی ہے۔ ہندوستان مستقل طور پر یہ مغالطہ دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ "کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے۔" لیکن صفحۂ ہستی پر اس سے بڑا جھوٹ ممکن نہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو جب ہندوستان آزاد ہوا' اس وقت کشمیر اس کا حصہ نہ تھا۔ قانونی طور پر ہندوستان کے دعوے کی بنیاد اس وثیقۂ الحاق پر رکھی جاتی ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ اس پر ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ کو مہاراجہ ہری سنگھ نے دستخط کیے۔ آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وثیقہ کے بارے میں بھی چند پہلو واضح کر دیے جائیں۔

(الف) مہاراجہ کے خلاف پوری ریاست میں بغاوت کی تحریک چل رہی تھی۔ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس دونوں ہی اس کے خلاف تھیں' اور اس پر سب کا اتفاق تھا کہ کشمیر کے مستقبل کا

فیصلہ مہاراجہ نہیں وہاں کے عوام کی مرضی سے ہونا چاہیے۔

(ب) مہاراجہ کا اقتدار ڈانواں ڈول تھا۔ اس کا حکم غیر مؤثر تھا اور وہ دارالخلافہ یعنی سری نگر کو چھوڑنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ خود شیخ عبداللہ نے اپنی سوانح عمری "آتش چنار" میں تسلیم کیا ہے کہ

> اِدھر یہ حالات رُونما ہو رہے تھے اُدھر مہاراجہ نے بوریا بستر باندھ کر اپنے جواہرات اور دیگر قیمتی اثاثہ کو صندوقوں میں بند کر کے ایک سو سے زیادہ گاڑیوں میں لاد دیا اور خود اس بھگوڑے قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے ۲۵ اکتوبر کو جموں کی جانب کوچ کر گیا۔
> (صفحہ ۴۱۱)

دوسرے الفاظ میں مہاراجہ اس وقت صاحبِ اقتدار نہیں تھا۔ اور بین الاقوامی قانون کا مسلّمہ اصول ہے کہ جس کی گرفت اقتدار پر نہ ہو وہ اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی بات طے نہیں کر سکتا۔

(ج) جس دستاویز پر مہاراجہ کے دستخطوں کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس کے بارے میں تازہ ترین تحقیق یہ ہے کہ وہ موجود ہی نہیں۔ نیز یہ کہ ہندوستانی فوجیں دراصل کسی بھی دستاویز پر دستخط سے پہلے سری نگر پہنچ گئی تھیں۔ پروفیسر الیسٹو لیمب نے اپنی دو تحقیقی کتابوں میں ناقابلِ تردید وثائق اور شواہد سے ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی فوجیں ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ کو کشمیر میں پہنچ گئیں، جبکہ مہاراجہ سے زبردستی جو دستخط حاصل کیے گئے وہ ۲۷ اکتوبر سے پہلے حاصل کرنا ناممکن تھا۔ جس دستاویز کو وثیقۂ الحاق کہا جاتا ہے وہ محض ایک پروفارما ہے جس سے کوئی چیز حتمی طور پر ثابت نہیں ہوتی۔ اگر مہاراجہ کے اس خط کو بھی سامنے رکھا جائے جو اس وقت لکھا گیا تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ الحاق کا فیصلہ نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنی پوزیشن سنبھالنے کی شرائط پیش کر رہا تھا۔ پروفیسر لیمب کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ آج تک کسی بین الاقوامی فورم پر اس اصل دستخط شدہ وثیقہ کو پیش نہیں کیا گیا۔ اس تحقیق کے صحیح ہونے پر شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور اس طرح ہندوستان کے دعوے کی ساری قانونی بنیاد ہی پادر ہوا ہو جاتی ہے

ع۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

(د) پھر یہ بات تو ہر حیثیت سے اور ہر ایک کے نزدیک مسلّم ہے کہ یہ ایک وقتی اور عارضی انتظام تھا جس کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی۔ اصل فیصلہ ریاست کے عوام کے آزادانہ استصواب کے ذریعے ہونا تھا جو ابھی تک نہیں ہوا ہے۔

خود شیخ عبداللہ لکھتے ہیں کہ

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے گورنر جنرل ہند کی حیثیت سے الحاق منظور کرتے ہوئے یہ مشہورِ زمانہ شرط لگا دی، جس نے بعد میں کشمیر کے سوال کو بین الاقوامی سطح تک پہنچایا۔ انھوں نے مہاراجہ کو لکھا: "جن مخصوص حالات کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کے پیش نظر میری حکومت ہندوستانی ڈومینین کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو اس اصول کے تحت قبول کرتی ہے کہ جس ریاست کے الحاق کا مسئلہ ما بہ نزاع ہو وہاں الحاق کا فیصلہ ریاستی عوام کی خواہش کے مطابق ہو۔ میری حکومت کی خواہش ہے کہ کشمیر میں جوں ہی امن و امان بحال ہو اور حملہ آوروں سے ریاست کو نجات ملے، تو ریاست کے الحاق کا مسئلہ عوام کی رائے سے طے کیا جائے۔۳

پنڈت نہرو نے جب ۱۹۵۴ میں آئین ساز اسمبلی کے ذریعے الحاق کا فیصلہ کرانے کی تجویز پیش کی تو خود شیخ عبداللہ نے ان کو یہ جواب دیا:

جواہر لال نے پھر اپنی بات دہرائی تو میں نے ان کی خواہش کی تکمیل کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اب یہ میری باری تھی، جواہر لال کا حافظہ تازہ کرانے کی اور انھیں یہ یاد دلانے کی کہ کشمیر میں رائے شماری کرانے کے سلسلے میں ہم ساری دنیا اور کشمیر کے سامنے قول ہار چکے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں اس قدر پابند (Commit) ہو چکے ہیں کہ اب ہم اپنی رسوائی کی قیمت پر ہی اپنے وعدے سے مکر سکتے ہیں۔ اگر ہم آئین ساز اسمبلی کے ذریعے الحاق کا فیصلہ کر لیں تو دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر ہندوستان کی شبیہ مجروح اور اس کی اخلاقی حیثیت مشکوک ہو جائے گی۔... سلامتی کونسل بھی اس فیصلے کو تسلیم نہیں کرے گی، پاکستان کے ماننے کی بات تو بہت دُور رہی۔ دنیا کی رائے عامہ پاکستان کی ہم نوائی کرے گی۔ خود کشمیری عوام کا آپ پر اعتماد متزلزل ہو جائے گا، اور جس تنازعے کو ختم کرنے کے لیے ہم یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ ایک شمشیرِ برہنہ کی طرح ہمارے سروں پر بدستور لٹکتا رہے گا۔۴

آج ۴۶ سال کے بعد یہ شمشیرِ برہنہ ہندوستان کے سر پر لٹک رہی ہے اور عالمی رائے عامہ کو یاد دلا رہی ہے کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور جب تک وہاں کے عوام اپنی آزاد مرضی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ نہ کر لیں کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ فرار کا ہر راستہ تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔

کشمیر کے بارے میں ہندوستان جس تضاد بیانی کا شکار ہے اسے ہندوستان کے مشہور صحافی کلدیپ نیئر نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے:

وزیراعظم نرسمہاراؤ نے یومِ آزادی پر لال قلعہ کی بلندیوں سے ارشاد فرمایا کہ "کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔" پھر چند ہی ماہ بعد پاکستان کی وزیراعظم بے نظیر بھٹو کو لکھا کہ "بھارت کشمیر کے بارے میں بات چیت کے لیے تیار ہے۔" جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ موصوف نے یہ مان لیا کہ اس علاقے کے مستقبل کا ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے۔ کوئی حاکمیتِ اعلیٰ رکھنے والا ملک اپنے کسی علاقے کی حیثیت کے بارے میں بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا جب تک وہ علاقہ متنازعہ نہ ہو۔۵

ہندوستان کے ایک نامور قانون دان اور ماہرِ دستورِ ریاست اے۔ جی۔ نورانی (A.G. Noorani) امریکہ کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی عہدہ دار مسز رابن رافیل اور ان کے پیش رَو جان ایچ کیلے کے ان بیانات کی روشنی میں جو کشمیر کو ایک متنازعہ علاقہ تسلیم کرنے کے باب میں انھوں نے دیے ہیں، لکھتے ہیں:

بعینہٖ یہی بات خود جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں ۷ اگست ۱۹۵۲ کو کہی تھی: "گو الحاق، قانون اور امرِواقع کے اعتبار سے ہو چکا ہے، مگر ایک اور حقیقت بھی مسلّم ہے، گو اس کا کوئی تعلق قانون سے نہیں، یعنی کشمیر کے عوام سے ہمارا عہد ـــــ بلکہ اگر آپ چاہیں تو اسے یوں بھی کہہ لیں، ساری دنیا کے عوام سے ہمارا عہد ـــــ کہ اس الحاق کی توثیق یا تنسیخ یا (ہندوستان سے) باہر نکل جانا، اگر کشمیری عوام کی رائے ہو۔

اسی طرح چند روز قبل یعنی ۲۶ جون کو انھوں نے کہا تھا: "میں اپنے دستور کے مکمل احترام کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ دستور میں کیا کہا گیا ہے، اگر کشمیر کے عوام یہ نہیں چاہتے تو پھر ان پر اس کا اطلاق نہیں ہو گا۔" نیز ایک اور موقع پر (۲ نومبر ۱۹۴۷) انھوں نے اعلان کیا تھا کہ "یہ ہی پالیسی (یعنی عوام کی رائے کا اتباع) کے احترام کا تقاضا تھا کہ ہم نے کشمیر کے وثیقۂ الحاق میں ایک شرط کا اضافہ کیا تھا۔" ماؤنٹ بیٹن کا خط جو اس وثیقہ کا ایک جزوِ لاینفک ہے، اس میں اس شرط کا ذکر بہ حیثیت ایک لازمی حصہ کے ہے۔ اسی نوعیت کی ضمانتیں سر این جی آئینگر نے بھی اس وقت دی تھیں جب دستور میں دفعہ ۳۷۰ کا اضافہ کیا جا رہا تھا (۱۷ اکتوبر ۱۹۴۹)۔ سر گرجا شنکر باج پائے نے اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے انڈیا و پاکستان کو

یہی ضمانت دی تھی (۲۱ نومبر ۱۹۴۹)' اور مسٹر مینن نے اقوامِ متحدہ کی سیکیورٹی کونسل میں یہی گواہی دی تھی (۸ فروری ۱۹۵۷) کہ الحاق صرف عارضی نوعیت کا ہے۔ یہی عارضی نوعیت اس وائٹ پیپر پر بھی بیان کی گئی ہے جو حکومتِ ہندوستان نے شائع کیا تھا (۱۹۴۸)۔ اس عہد و پیمان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں آج ۱۹۹۴ میں ان پر آج کی صورتِ حال کی روشنی میں عمل ہونا چاہیے۔"۶۔

اے۔ جی نورانی اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں کہ نہرو نے لیاقت علی خاں سے اپنی خط و کتابت میں مسئلہ کشمیر کو ایک عالمی مسئلہ (International problem) تسلیم کیا تھا اور ۲۶ فروری ۱۹۵۵ کو مسٹر لکشمی چرن کے سوال کا جواب دیتے ہوئے لوک سبھا میں اعلان کیا تھا کہ محض کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کی قرارداد سے یہ مسئلہ طے نہیں ہو سکتا۔ پنڈت نہرو کے الفاظ تھے "اس نوعیت کا مسئلہ محض یک طرفہ طور پر طے نہیں کیا جا سکتا۔" (A question like this can not be solved unilaterally.) اور پھر صاحبِ مقالہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ انھی پنڈت نہرو نے اپریل ۱۹۵۶ میں کشمیر کے مسئلے کو یک طرفہ حل کرنے کا اعلان کر ڈالا۔ نورانی لکھتے ہیں:

> وہ (یعنی پنڈت نہرو) چاہتے تھے کہ دنیا اس مسئلے کو' جسے ۸ جولائی ۱۹۴۹ میں خود انھی نے ایک عالمی مسئلہ (A world question) کہا تھا' اب اس کے یک طرفہ حل کو قبول کر لے اور بس خاموش ہو جائے۔ لیکن دنیا نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔۷۔

یہی بات مشہور سیاسی لیڈر جے پرکاش نرائن نے ۱۹۶۴ میں کہی تھی:

> یہ بات لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہم نے جو عہد کیا تھا وہ محض پاکستان سے نہیں تھا' یہ عہد تو کشمیر کے عوام سے تھا۔ پاکستان کی خطاؤں کی سزا کشمیری عوام کو دینے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ ان تمام امور کی روشنی میں میری نگاہ میں اس معاملے میں مبنی برحق اور تعمیری سوچ یہی ہے کہ کشمیر کے عوام کو ان کے حقِ خودارادی سے محروم نہ کیا جائے۔ نہ یہ ہی درست ہے کہ ہم یہ کہیں کہ وہ اپنے اس حق کو استعمال کر چکے ہیں یا ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ اب اس حق کا استعمال غیر منطقی اور ناقابلِ عمل ہے۔ ہم چاہے کتنے ہی زور سے یہ بات کہیں کہ ہندوستان سے کشمیر کا الحاق مستقل اور ناقابلِ تنسیخ ہے' دنیا اسے ہرگز تسلیم نہیں کرے گی۔۸۔

جے پرکاش نرائن کا ایک خط جو ۲۳ جون ۱۹۶۶ء کو اندرا گاندھی کو لکھا گیا تھا اور جسے ایک ہندوستانی دانشور و صحافی ایم۔ جے۔ اکبر نے اپنی کتاب Kashmir Behind the Vale میں نقل کیا ہے۔ ہندوستان کے سوچنے سمجھنے والے طبقات کے اضطراب اور ان کے ضمیر کی کسک کا غماز ہے۔

جے پرکاش نرائن لکھتے ہیں:

> ہم جمہوریت کا دعویٰ کرتے ہیں' لیکن کشمیر پر محض طاقت کے بل بوتے پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سیکولرزم کی بات کرتے ہیں' لیکن ہندو قوم پرستی کو موقع دیتے ہیں کہ ہمیں مجبور کرے کہ تشدد کے ذریعے اس کا تسلط قائم ہو۔ کشمیر کی وجہ سے ہر دوسری چیز سے زیادہ دنیا میں ہمارا وقار مجروح ہوا ہے۔ دنیا میں کوئی ایک بھی ملک ایسا نہیں ہے' بشمول روس' جو ہماری کشمیر پالیسی کو پسند کرتا ہو' خواہ ان میں کچھ' دوسری وجوہ سے ہماری تائید ہی کیوں نہ کر دیتے ہوں' مسئلہ کشمیر زندہ ہے اور اس لیے نہیں کہ پاکستان اسے ہم سے چھین لینا چاہتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہاں کے عوام کے دلوں میں گہری اور ہمہ گیر بیداری اور بے اطمینانی ہے۔۹

ہماری اب تک کی معروضات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے' ریاست جموں و کشمیر آج بھی اسی طرح ایک متنازعہ علاقہ ہے جس طرح ۱۹۴۷ میں ہندوستان کی فوج کشی کے وقت تھا اور اہل کشمیر کی حالیہ جدوجہد نے ایک بار پھر اس مسئلے کو ایسی قوت سے زندہ کر دیا ہے کہ اب اس کے مستقل حل کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں ہے اور مسئلے کا مستقل اور حقیقی معنوں میں جمہوری حل صرف استصواب رائے ہے۔

مسئلہ کشمیر کی اس نوعیت کے واضح ہو جانے سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ کشمیر میں جو تحریک برپا ہے وہ دراصل آزادی اور حقِ خودارادیت کی تحریک ہے۔ اسے علیحدگی پسندی کی تحریک کہنا ایک صریح ظلم اور غلط بیانی ہے' اور دہشت گردی قرار دینا اس سے بھی بڑا جھوٹ اور ظلم۔ اس لیے کہ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ اپنے دفاع میں اور اپنی آزادی کے حصول کے لیے اگر باقی تمام راستے بند کر دیے گئے ہوں' تو مسلح جدوجہد کی جا سکتی ہے' خصوصیت سے جہاں حکومت جبر اور قوت کا استعمال کر رہی ہو وہاں اپنی آزادی کے حصول کے لیے استعماری قوتوں کا مقابلہ انھی کے ہتھیاروں سے کیا جا سکتا ہے۔ اس حق کا اشارہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں بھی موجود

ہے۔ خود غیر جانبدار تحریک (NAM) کے اعلانات میں افراد کے خلاف تشدد' ریاستی تشدد اور آزادی کی جدوجہد کو ایک دوسرے سے ممیز کیا گیا۔ بقول ڈیوڈ راپو پورٹ:

> دوسری عالمی جنگ کے فوراً بعد وہ تشدد (terrorists) جو سامراجی قوت کے خلاف آزادی کی جدوجہد کر رہے ہوں ان کو "تشدد پسند" نہیں بلکہ آزادی کے مجاہد (freedom fighters) کہا جانے لگا۔ حتیٰ کہ مغرب میں بھی ان کے لیے یہی اصطلاح استعمال ہوئی۔۱۰

یہی وجہ ہے کہ الجزائر کے انقلاب نے جو نمونہ پیش کیا اگلے تیس سال تک اسی پر سامراج دشمن تحریک بڑھتی رہی۔ تنظیم آزادیِ فلسطین کو اقوامِ متحدہ میں آبزرور کی حیثیت حاصل ہوئی۔ جنوبی افریقہ میں اے این سی کی جدوجہد کو عالمی تائید حاصل ہوئی۔ مجاہدینِ افغانستان کو حریت کا نقیب قرار دیا گیا۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کے لائق ہے کہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی (۱۹۷۲) میں "سیاسی تشدد" کو زیرِ بحث لایا گیا تو تشدد کی کسی ایک تعریف پر اتفاق نہ ہو سکا اور ارکان کی ایک نمایاں تعداد نے اس جدوجہد کو' خواہ اس میں بظاہر تشدد کا پہلو بھی موجود ہو' جو ایک مبنی برحق سیاسی نصب العین مثلاً حقِ خودارادیت کے لیے کی جائے' سیاسی تشدد ماننے سے انکار کر دیا۔۱۱

کشمیر میں برپا جہادِ حریت' حقِ خودارادی کی تحریک ہے۔ اسے نہ علیحدگی پسندی کی تحریک کہا جا سکتا ہے اور نہ معروف معنی میں تشدد اور دہشت گردی کی تحریک۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ تحریک خالص عوامی تحریک ہے۔ اسے مقبوضہ کشمیر کے عوام کی ہمہ جہتی تائید حاصل ہے۔ یہ کوئی باہر سے درآمد شدہ تحریک نہیں ہے۔ پھر یہ تحریک نتیجہ ہے ہندوستان کی ظالمانہ اور آمرانہ پالیسیوں کا' جن پر وہ گذشتہ ۴۶ سال سے عمل پیرا ہے۔ نیز یہ جدوجہد ایک دن میں کہیں خلا سے نمودار نہیں ہوئی۔ حالات کا کھلی نگاہ سے نظارہ کیا جائے تو اس میں ایک تسلسل اور تدریجی ارتقا معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ تحریک نشیب و فراز سے گزری ہے۔ لیکن ۱۹۴۷ سے آج تک اس کے تسلسل کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ مارچ ۱۹۸۷ اور پھر جنوری ۱۹۹۰ سے یہ اپنے فراز کی طرف معروفِ عمل ہے اور اس زمانہ میں اس میں وسعت اور گہرائی دونوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے جس کے نتیجہ میں آج اسے بلاخوفِ تردید قومی تحریک کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی وہ کونسی پالیسیاں ہیں جن کے نتیجے میں حالات اتنے خراب ہوئے ہیں اور بالآخر

اس تحریک نے ہمہ گیر بغاوت کا روپ دھار لیا ہے۔ نیز یہ بات کہ تحریک بنیادی طور پر داخلی تحریک ہے اور آج مقبوضہ کشمیر کی تقریباً تمام مسلم آبادی ہندوستان اور اس کی حکومت سے بیزار ہے اور اب اسے ہندوستان کے چنگل سے آزادی ہی میں اپنے لیے زندگی اور عزت کا سامان نظر آ رہا ہے۔ ہم ان دونوں پہلوؤں پر صرف ہندوستان کے چوٹی کے دانشوروں اور صحافیوں کے تجزیوں کی کچھ جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر رامیش ٹھاکر' ایک ہندوستانی دانشور جو نیوزی لینڈ کی **University of Otago** میں ایشین اسٹڈیز کا ڈائریکٹر ہے' مشہور عالمی جریدے فارن افیئرز **(Foreign Affairs)** کے ۱۹۹۴ کے شمارہ میں ہندوستان کی کشمیر پالیسی کے دیوالیہ پن کا اس طرح تجزیہ کرتا ہے:

کشمیر میں امن کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بغاوت کی وہ تحریک نہیں جسے سرمایہ اور اسلحہ اسلام آباد سے مل رہا ہو' بلکہ پالیسی کے میدان میں وہ خلا ہے جو دہلی میں پایا جاتا ہے۔ ۱۹۴۸ سے کشمیر پر ہندوستان کے تسلط کی تاریخ نے پورے ہند کے لیے بڑے نقصان دہ نتائج پیدا کیے ہیں۔ ہندوستان بجا طور پر فخر کرتا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے' لیکن کشمیر پر جبری تسلط اور قبضے نے جمہوریت کے اس دعوے کو بے اثر کر دیا ہے۔ کشمیر میں جمہوری اداروں کو بار بار انتخابی عمل میں در اندازی اور بدعنوانی کے ذریعے تباہ کر دیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اس ریاست میں کٹھ پتلی حکومت کے سوا کوئی برسرِاقتدار ہو۔ گذشتہ دو سال میں ہندوستانی حکمرانوں کا دامن کشمیر میں پولیس اور فوج کی ظالمانہ کارروائیوں سے داغدار ہے۔... جس طرح کشمیر کو ہندوستان میں محض طاقت کے بَل پر رکھا گیا ہے اس سے خود وفاق کا سارا تجربہ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ دہلی کے حکمرانوں نے کشمیر کے عوام کی خواہشات کا کوئی احترام نہیں کیا ہے۔ ہندوستان میں کشمیر کو ضم کرنے کا تجربہ سرکاری خزانہ پر بھی ایک بڑا بوجھ ثابت ہوا ہے۔ گذشتہ دو سال میں ہندوستان کی کشمیر پالیسی کے نتیجے میں ملک کو اخلاقی' معاشی' سیاسی اور بین الاقوامی طور پر خسارہ ہی خسارہ حاصل ہوا ہے۔ ۱۹۹۰ کی تحریکِ مزاحمت کے نتیجے میں ریاست کا انتظام مفلوج ہو گیا ہے۔ مسئلے کو محض امن و امان اور نفاذِ قانون کا معاملہ سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ کرفیو' پولیس کی روز افزوں سختیوں اور فوجی اور نیم فوجی قوتوں کے طاقت اور مزید طاقت کے استعمال کے ذریعے علیحدگی پسندوں کو دبانے اور مجبور کرنے کا راستہ اختیار کیا گیا ہے' جس کا

نتیجہ الٹا ہوا ہے۔ یعنی اس کے نتیجے میں علیحدگی پسندی کا رجحان اور بھی قوی ہو گیا ہے اور اسے سوسائٹی کے وسیع دائرے سے مدد و معاون مل گئے ہیں، جن کا مقصد اور ہدف کشمیر کو ہندوستان کے کنٹرول سے آزاد کرانا ہے۔۱۲

مشہور صحافی اور تجزیہ نگار خوشونت سنگھ لکھتا ہے:

ہمارے زیرِ انتظام کشمیر میں متعدد انتخاب ہوئے ہیں اور متعدد وزرائے اعلیٰ برسرِ اقتدار آئے ہیں۔ لیکن یہ تمام انتخاب کسی حیثیت سے بھی اتنے منصفانہ اور آزادانہ نہ تھے جتنے دوسری ریاستوں میں ہونے والے انتخاب۔ نتیجتاً جو لوگ وزرائے اعلیٰ بنے ان کو عوامی مقبولیت کی حامل قیادت نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا تو دراصل دہلی سے تقرر ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی دہلی نے ان کو نامناسب پایا بیک بینی و دوگوش روانہ کر دیا اور ریاست کو گورنر کے راج تلے لے آیا گیا۔ وہ لوگ جو دریائے جہلم کی وادی کے حسین مقامات پر گئے ہیں یا جنھیں کشمیری مسلمان دوستوں سے ملنے کا موقع ملا ہے وہ اعتراف کریں گے کہ کشمیر کے مسلمان اپنے کو ہندوستانی کہنے سے کتراتے ہیں۔ گو وہ ہندوستانی پاسپورٹ پر سفر کرتے ہیں مگر جب بھی بات کرتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ "تم ہندوستانی" اور جب اپنی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں "ہم کشمیری۔" ہم نے وادی میں کروڑوں روپیہ لگایا لیکن وہ تو ایک ایسی کھائی ثابت ہوئی جس کی کوئی تہہ نہ ہو۔ عام آدمی کی زبوں حالی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جب حالات بگڑے تو ہم نے فوج اور نیم فوجی جوان بھیجے تاکہ حالات کو قابو میں کریں۔ وہ ہمیں انسانی حقوق کی پامالی اور جبر و تشدد کا مجرم قرار دیتے ہیں۔ گو ان الزامات میں کچھ مبالغہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اس بات کا انکار تو ممکن نہیں کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں تو ہوئی ہیں۔۔۔۔ آیئے حقائق کو تسلیم کریں: پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کشمیری مسلمانوں کی تائید سے مکمل طور پر محروم ہو چکے ہیں اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اخلاقی طور پر ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ ان لوگوں پر اپنے کو محض طاقت کے بل بوتے پر مسلط کریں جو ہم کو نہیں چاہتے۔ اور تیسری حقیقت "یہ ہے کہ وادی اتنی چھوٹی ہے اور سیاحوں اور دستکاری پر انحصار کی وجہ سے قطعاً" اس پوزیشن میں نہیں کہ ایک مکمل طور پر آزاد ریاست کی حیثیت سے ترقی کر سکے۔

.... ایک سمجھ دار قوم کی حیثیت سے ہمیں اب طوطے کی طرح یہ رٹ لگانا ترک کر دینا

چاہیے کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے اور مسئلے کا حل صرف شملہ معاہدہ کے تحت ممکن ہے۔ اس تکرار کا حاصل تو صرف گرم گفتاری ہے! اور آخری بات: ہمیں اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ جو چیز سب سے اہم اور اصل مطلوب ہے وہ وادی کے لوگوں کی خوشی اور اطمینان ہے۔" ۱۴

ایم۔ جے۔ اکبر تحریکِ آزادی کے مخالفین میں سے ہیں' لیکن حالات کا جو نقشہ کھینچتے ہیں وہ ملاحظہ کے لائق ہے:

عسکریت کے علمبردار بڑی تیزی سے حاشیہ سے وسط دریا (mainstream) کی طرف بڑھنے لگے اور ایک ایسی تیز رفتاری سے جس کی نہ خود ان کو توقع تھی اور نہ ہی ان کے پاکستانی سرپرستوں کو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۸۹ میں جس حکمتِ عملی پر وہ عمل پیرا تھے وہ یہ تھی کہ سال کے متعین دنوں میں متعین مقامات پر وہ سرگرم تھے اور یہ جانچ رہے تھے کہ ان کی مقبولیت کتنی ہے۔ ہر بار انھیں اپنی مقبولیت کا گراف اوپر ہی جاتا نظر آیا۔ پھر نومبر ۱۹۸۹ کے انتخابات ہوئے۔ اس موقع پر تو ان کے اندازے بھی غلط ثابت ہوئے جو حالات سے مایوس تھے۔ عام انتخابات میں عسکری قوتوں کو مکمل عوامی تائید حاصل ہوئی۔ صرف پانچ فیصد افراد ووٹ دینے کے لیے گئے' باقی نے بائیکاٹ کی پکار کا ساتھ دیا۔ اب حالات اس مقام پر پہنچ گئے تھے جو ڈرامے کا فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا... ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ تک آزادی کی تحریک کے لیے عوامی تائید ڈھکی چھپی تھی' مکمل اور واضح نہیں تھی۔ جگ موہن کے آنے کے بعد حالات بدل گئے۔ لوگ پہلے تو خائف ہوئے لیکن پھر ہمت کا جوالہ پھوٹا اور خوف کی جگہ اس جرات نے لے لی جو ناامیدی کی پیداوار ہوتی ہے۔ لوگ گلیوں میں جوق در جوق آنے لگے۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات عورتوں' بوڑھوں اور بچوں کا طوفان تھا۔ انتظامیہ حواس باختہ ہوگئی' اور گولی چلانے کا حکم دے دیا' پھر کیا تھا۔ مرنے والوں کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صرف اس دن گوکا دل کے مقام پر پچاس لاشیں تو ٹھنڈی ہوگئیں۔ یہ دن یادگار بن گیا۔ ۱۹ جنوری ایک تاریخی موڑ ہے جس نے تحریک کو عوامی ابھار عطا کیا... سری نگر کی ہر مسجد جوش اور جذبے کا ایک قلعہ بن گئی۔ ہر خطبہ علیحدگی کا ناقوس بن گیا۔ لاؤڈ اسپیکر کی آوازوں نے فضاؤں کو بھر دیا اور کیسٹ آزادی کے ترانے الاپنے لگے۔ ہر طرف سے یہی شور تھا: "ہم کیا چاہتے ہیں---

آزادی' آزادی' اللہ اکبر' اللہ اکبر۔

ایم۔ جے۔ اکبر اپنی کتاب کو شیخ عبداللہ کے مزار کی حالت زار پر ختم کرتا ہے:

اس سادہ اور پُروقار مزار کے چاروں طرف آج اسلحہ بردار افراد بیٹھے ہیں۔ پولیس والے فوج کے پورے بارود خانے سے مسلح! شیخ کی زندگی تو پولیس کی نگرانی میں گزری' لیکن موت کے بعد بھی پولیس ہی اس کا گھیرا کیے ہوئے ہے۔ دشمن کس طرح بدلتے ہیں! ہاں اتنی بات تو یقینی ہے' کشمیر کی روح امن و آشتی سے شاد کام کیسے ہو سکتی ہے' جب شیخ محمد عبداللہ کے مزار کی بھی حفاظت کے لیے بندوقوں کا سہارا لینا پڑے ۱۴۔

ڈاکٹر منظور عالم کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں اور آج کل ورلڈ بنک کے مشیر ہیں۔ جدہ کے سعودی گزٹ میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

۱۹۸۷ کے انتخابات کے بعد سے کشمیر کے حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ آج کشمیر ہندوستان سے کلی طور پر مغائرت کا شکار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر کبھی بھی جذباتی طور پر ہندوستان کا حصہ نہیں تھا اور نہ ہی کبھی ہندوستان کی حکومت نے اسے اپنے سے یک جان کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔ گو کشمیر کو مالی معاملات میں ایک خاص حیثیت دی گئی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ناروا امتیازی سلوک کا نشانہ رہا۔ وہ ریاستیں جن کو خاص حیثیت (special status) حاصل ہے ان کو مرکزی امداد کا ۹۰ فیصدی بطور گرانٹ اور صرف ۱۰ فیصدی بطور قرض ملتا ہے لیکن کشمیر کا معاملہ یہ ہے کہ ۹۰-۱۹۸۹ تک مرکزی حکومت سے جو کچھ کشمیر کو ملا اس کا ۷۰ فیصد بطور قرض اور صرف ۳۰ فیصدی بطور گرانٹ تھا۔ نیز کشمیر سے ہندوستان کی تجارت غیر متوازن ہے جس کے نتیجے میں عملاً کشمیر سے سرمایہ ہندوستان کو منتقل ہو رہا ہے۔

اجیت بھٹا چاریہ لکھتا ہے کہ "نئی دہلی کشمیر کی منتخب قانونی حکومتوں کی قسمت سے کھیلتی رہی اور جس وزیراعظم سے ناخوش ہوئی اس کو گرانے میں لگ گئی۔"

ویر شنگھوی ہفت روزہ سنڈے (۲۶ ستمبر۔ ۲ اکتوبر ۱۹۹۳' ص-۹) میں لکھتا ہے کہ "کتنے کشمیری مسلمان ہوں گے جو اپنے کو ہندوستانی سمجھتے ہوں اور ہم نے بھی اہلِ کشمیر کو غیر ہی سمجھا۔ ہم نے حزبِ اختلاف کے قائدین کو جیلوں میں محبوس کیا' انتخابات کو بدعنوانیوں کی نذر کیا' استصواب سے احتراز کیا اور ایک حد تک اس وجہ سے کہ ہم کو یقین نہیں تھا کہ نتیجہ کس رخ پر ہو گا۔"

پاکستان اس وقت کشمیر میں وہی کھیل کھیل رہا ہے جو ہندوستان نے ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کے بنانے میں کھیلا تھا۔ اس وقت پورا مشرقی پاکستان' مغربی پاکستان کے تسلط کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسی طرح آج ہندوستان کشمیر کے مسئلے کو محض لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بنا کر پیش کر رہا ہے' حالانکہ تقریباً کشمیر کی پوری وادی ہندوستانی حکمرانوں کے خلاف اعلانِ بغاوت کر رہی ہے۔ اس کا اعتراف آر۔ ڈی۔ ساٹھے' سابق سیکرٹری خارجہ نے اپنے ایک حالیہ پریس کے بیان میں کیا ہے۔ انھوں نے حکومتِ ہند کو متوجہ کیا ہے کہ "آج کشمیری مسلمانوں میں ہندوستان کا کوئی دوست باقی نہیں رہا ہے۔ کشمیری مسلمان بڑی شدت سے ہندوستان کے ساتھ رہنے کا مخالف ہے۔ بلکہ اب تو اس کو بندوق کا خوف بھی باقی نہیں رہا۔" (ملاحظہ ہو روزنامہ The Hindu' ۷ ستمبر ۱۹۹۳)۔

کشمیری مسلمانوں کی ہندوستان سے مغائرت اور بے زاری کو جنرل اشوک متا ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:"جو اشارے کشمیر کی وادی سے مل رہے ہیں وہ صاف بتاتے ہیں کہ آج وادی میں حکم عسکری نوجوانوں کا چل رہا ہے' ہندوستانی انتظامیہ کا نہیں" (ہفت روزہ Sunday' ۱۰-۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳)۔ وادی کے تمام اہم مقامات' خصوصیت سے سری نگر' سوپور' بارہ مولا' مجاہدین کے قبضے میں ہیں۔ ہندوستانی انتظامیہ سے عوام کی مغائرت مکمل ہے۔ اس کی بڑی وجہ ہماری یہ پالیسی ہے کہ ہم نے کشمیری مزاحمت کا مقابلہ بس بندوق کی نالی سے کیا ہے۔ کشمیر پر جو بھی بھاری رقوم ہم نے صرف کی ہیں وہ سب بیکار گئی ہیں۔ وادی کی آبادی کی عظیم اکثریت ہندوستان سے کوئی سروکار رکھنے کی روادار نہیں۔ (ملاحظہ ہو Sunday' ۷-۱۳ نومبر ۱۹۹۳' صفحہ ۳۵)۔ ایک اعلیٰ فوجی افسر کا بیان ہے کہ "ہم ان سے عددی قوت میں کہیں زیادہ ہیں۔ اسی طرح ہمارے پاس ان سے کہیں زیادہ بہتر ہتھیار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی اچھی پٹائی کر سکتے ہیں۔ مگر کیا کریں ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام مکمل طور پر ہماری انتظامیہ سے بے زار ہیں۔" ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پولیس بھی یہی کہتا ہے کہ "عوام کی یہ بے زاری اور مغائرت ہماری اصل اور سب سے بڑی دشمن ہے۔ ہم یہ جنگ جیت ہی نہیں سکتے اگر ہمیں عوام کا تعاون حاصل نہیں" (ملاحظہ ہو India Today' ۱۵ ستمبر ۱۹۹۳)۔ نہ صرف یہ کہ عوام ہمارے ساتھ نہیں بلکہ لوکل

انتظامیہ' مقامی کشمیری بیوروکریسی اور پولیس بھی ہم سے دُور ہو گئی ہے اور اس کی وجہ وہ بے اعتمادی اور شک و شبہ کی رَوِش ہے جس کا مظاہرہ ہندوستانی انتظامیہ مقامی انتظامیہ کے بارے میں اختیار کرتی ہے۱۵۔

ڈاکٹر منظور عالم معاشی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

چودہ سالہ افغان جنگ نے روس کی معیشت کو تباہ کر دیا۔ اور بالآخر روس کو افغانستان میں اپنی فوج کشی ترک کرنا پڑی اور فوجوں کو واپس بلانا پڑا۔ لیکن پھر بھی افغان جنگ کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ روس ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس میں ہمارے لیے بھی ایک سبق ہے۔ ہندوستانی افواج اور نیم فوجی دستے ایک نہایت مشکل مقام پر سخت نفسیاتی دباؤ کے تحت کام کر رہے ہیں۔ جنرل اشوک مہتا کے بقول "کشمیر میں ہمارے سیکیورٹی فورس میں جسمانی اور اخلاقی ہر دو اعتبار سے ٹوٹ پھوٹ کا عمل اسی طرح جاری ہے جس طرح بدن سے سست رفتاری سے خون رسنے سے بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس فوجی اور انتظامی مشینری کی نااہلی نے مجاہدین (militants) کو ان پر نمایاں فوقیت حاصل کرنے کا موقع دیا ہے" (ملاحظہ ہو Sunday' ۱۸۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۹۳)۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان نے ابھی تک ۲۰۰ سے ۶۰۰ بلین روپے کی ضروری اشیا کشمیر روانہ کی ہیں۔ مختصراً معقول اخراجات کے باوجود ہندوستان اور کشمیر کے بارے میں مستقبل کے امکانات روشن نہیں۔ کشمیر میں بغاوت کے نتیجے میں حکومت مجبور ہوئی ہے کہ نصف ملین فوجی اور نیم فوجی اس جنگ میں جھونک دے۔ دولت کے لیے فوج کی بھوک ناقابلِ تسکین ہے جبکہ ہندوستان بیرونی دنیا کا ۹۰ بلین ڈالر کے قریب مقروض ہے اور اس کا دو تہائی بس فوج کو چوکس رکھنے کے لیے صرف ہوا ہے (ملاحظہ ہو Sunday' ۱۴ نومبر ۹۳)۱۶۔

جیت بھٹا چاریہ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:

کشمیریوں کے پاکستان کے دو قومی نظریہ کو رَدّ کرنے اور ایک سیکولر جمہوری ہندوستان سے ناطہ جوڑنے سے جو ہمارا سر عزت و افتخار سے بلند ہوا تھا آج وہ شرم سے جھک گیا ہے۔ اس وقت وادی میں جن جذبات کا اظہار ہو رہا ہے ان کا مظہر بھارت کے خلاف کیے جانے والے مظاہرے ہیں۔ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ آج ہندوستانی سیکیورٹی فورسز وہی کردار ادا کر رہی ہیں جو آزادی کی جدوجہد کے دوران برطانوی فوج آزادی

کے متوالوں کے خلاف ادا کرتی تھی۔ ضروری نہیں کہ ایک عام کشمیری مسلمان عسکریت کے علمبرداروں کی سرگرمیوں کی حمایت کرے لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہندوستان سے نفرت اور بے اعتمادی کی حد تک ان کے ہم نوا ہیں۔ پاکستان نے اس بے چینی سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنا پورا زور لگایا ہے جیسا کہ اس نے ۱۹۴۷ سے اب تک کیا ہے' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس بے چینی کو پاکستان نے پیدا نہیں کیا۔ ہمیں خود اپنی پالیسیوں اور اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے تاکہ ہم یہ متعین کر سکیں کہ کہاں کیا خرابی پیدا ہوئی اور اس کا کس طرح تدارک کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ریاست جموں و کشمیر کو انڈین یونین کی باقی تمام ریاستوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندوستان کا حصہ نہیں بنی جس طرح باقی علاقے ہندوستان کا حصہ بنے۔ وثیقۂ الحاق کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ ہندوستان الحاق کو مستقل شکل دینے سے پہلے کشمیر کے لوگوں کی مرضی معلوم کرے گا[۱۷]۔

مسئلہ کے حل کا ذکر کرتے ہوئے اجیت بھٹاچاریہ کہتا ہے کہ:

واحد راستہ جو مجھے نظر آتا ہے وہ تو یہی ہے کہ ہم کشمیر کے لوگوں سے اپنے کیے ہوئے وعدے کو پورا کریں اور ان کو یہ موقع دیں کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ ہر وہ دن کہ فوجی حکمرانی کے تحت گزر رہا ہے اس بات کو یقینی بنا رہا ہے کہ وہ ہندوستان سے اپنے ربط و تعلق کو منقطع کر لیں گے[۱۸]۔

مندرجہ بالا اقتباسات کشمیر کی اصولی صورتِ حال کو سمجھنے اور خود ہندوستان کے دانشوروں اور سوچنے سمجھنے والے عناصر کے اضطراب اور بے چینی کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان سے یہ بات بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر کی تحریکِ مزاحمت اندرونی اسباب کی پیدا کردہ ہے اور اسے جموں و کشمیر کے مسلمانوں کی عوامی تائید حاصل ہے۔ نیز یہ تحریک اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں اب محض قوت سے اسے دبانا ممکن نہیں۔ کشمیر کے مسلمانوں نے ہندوستان سے اپنی نفرت کا برملا اظہار کر دیا ہے اور انھوں نے اس کی غلامی سے نجات کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی ہے۔ اس سلسلے میں جو قربانیاں وہ پیش کر رہے ہیں وہ تاریخ کا ایک تابناک باب ہیں۔ لیکن اب اصل سوال یہ ہے کہ پاکستان اور عالمِ اسلام ان کی کس طرح مدد کرے۔ قربانیوں کی ایک حد ہوتی ہے' اور تاریخ گواہ ہے کہ جب ایک قوم یہ فیصلہ کر لے کہ وہ اپنے ایمان' اپنی آزادی اور

اپنی عزت کے لیے جان قربان کرنے کو تیار ہے تو پھر کوئی دنیاوی قوت اسے غلام نہیں رکھ سکتی۔ لیکن قوت اور صلاحیت کا جو تفاوت ہندوستان کی عسکری مشین اور کشمیر کے تقریباً نہتے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس بہادر اور غیور قوم کی بھرپور مدد کی جائے تاکہ وہ کم سے کم وقت میں اپنے مقاصد حاصل کر سکے۔

کشمیر کے مسلمان آج صرف کشمیر کی جنگ ہی نہیں لڑ رہے وہ پاکستان کے تحفظ اور اس کی تکمیل کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں' وہ اسلام کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ پاکستان کے عوام اور پاکستان کی حکومت' امتِ مسلمہ اور مسلمان حکومتیں' ایک واضح کشمیر پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔ کسی وقت ہم ان شاء اللہ پاکستان کی کشمیر پالیسی پر نظر ڈالیں گے' یہاں کی مقتدر قوتوں کی مصلحت کوشی' خود غرضی اور بے ہمتی پر مبنی طرزِ عمل پر بھی روشنی ڈالیں گے' اور ان اقدامات کی نشاندہی کریں گے جو اس تحریک کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ نیز ان خطرات پر بھی گفتگو کریں گے جو تحریک کو اس کے حقیقی مقاصد سے ہٹانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور جن کے لیے وہ اقوام اور ادارے سرگرم ہیں جو اسلامی احیا کو ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔

حواشی

۱۔ جنوری ۱۹۹۰ سے دسمبر ۱۹۹۳ تک ہندوستانی مظالم کا نشانہ بننے والوں کے بارے میں تحقیق شدہ اعداد و شمار یہ ہیں:

شہدا	۳۵'۰۰۰
زخمی' بشمول جو مستقل طور پر معذور ہو گئے ہیں	۳۰'۹۰۰
اسکول' مدرسے' مکان اور دوکانیں جو نذر آتش کی گئیں	۲۷'۳۷۰
وہ افراد جن کو زندہ جلایا گیا	۲'۱۰۰
خواتین جن کی اجتماعی بے حرمتی کی گئی	۴'۷۰۰
خواتین جو اجتماعی آبروریزی کے دوران شہید ہو گئیں	۲۱۰
خواتین جن کی لاشیں جہلم کے ذریعے پاکستان آئیں	۳۹۰
بھارت کی جیلوں اور تعذیب خانوں میں محبوس	۱۸'۰۰۰
جموں اور کشمیر کی جیلوں اور تعذیب خانوں میں محبوس	۲۲'۳۰۰

آزاد کشمیر آنے والے مہاجرین ۳۹٬۵۰۰

بحوالہ Facts File: Kashmir از بریگیڈیئر محمد شفیع خان۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۳۔

۲۔ ملاحظہ ہو Alastair Lamb کی کتاب

"Kashmir: A Disputed legacy 1846-1990," Roxford Books, Hertingfordbury, 1991

اور اسی مصنف کی تازہ ترین کتاب 'Birth of a tragedy: Kashmir 1947, مطبوعہ Roxford Books, 1994.

۳۔ شیخ محمد عبداللہ، "آتش چنار"، چودھری اکیڈمی، لاہور، ص ۳۱۸۔

۴۔ ایضاً، ص ۲۶-۵۲۵۔

Kuldip Nayyar, "Kashmir: Cause or Consequence" The Radience, Delhi, 2-8 January, 1994. 5

A.G. Noorani "A Settlement for Kashmir", The Radience, Delhi, 5-11, Dec. 1993. 6

۷۔ ایضاً۔

۸۔ ایضاً۔

M.J. Akbar, "Kashmir Behind The Vale," Viking, Delhi, 1991, p. 183. quoted from Bhola Chatterjei's "Conflict in JP's Politics," Ankur, Delhi. 9

David C. Rapoport. "Terrorism", in Encyclopaedia of Government and Politics, ed. by Mary Hawkesworth and Maurice Kogen, Routledge, London and New York. 1992. vol. 2. p. 1062. 10

F.S. Northedge. "The Resort to Arms", in The Use of Force in International Relations, ed. by F.S Northedge, Faber and Faber, London, 1974, p. 13. 11

Ramesh Thakur, "India after nonalignment", in Foreign Affairs, vol. 71, No. 2, Spring 1992, p.170. 12

Khushwant Singh, "Kashmir and Human Rights," The Dawn, 30 Nov. 1993. 13

M.J. Akbar, "Kashmir Behind the Vale", pp. 213-223. 14

Dr. S. Manzoor Alam, "Kashmir: A Dream, Delhi demolished slowly", 15

Saudi Gazzette. 27 & 28 Feb. 1994.

۱۶۔ ایضاً، ۲۸ فروری ۱۹۹۴۔

Ajit Bhattacharjia, "Kashmiris Must be Allowed to Decide Their Own 17 Future." The pioneer, 29 Oct. 1993.

۱۸۔ ایضاً۔

-۶۰ سال پہلے-

ملتِ اسلامی کی عمارت دراصل اس ترتیب پر قائم ہوئی تھی کہ پہلے قرآن مجید' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت' پھر اہلِ علم و بصیرت کا اجتہاد۔ لیکن بدقسمتی سے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا گیا' اور نئی ترتیب یوں قرار پائی کہ پہلے ایک خاص زمانہ کے اہلِ علم و بصیرت کا اجتہاد' پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' اور سب سے آخر میں قرآن۔ یہی نئی ترتیب اس جمود کی ذمہ دار ہے جس نے اسلام کو ایک ساکن وغیر متحرک چیز بنا دیا ہے...

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے' اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرّہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اس علم کا فیضان' قرآن کی آیات اور اس کے لانے والے کے سینے میں ہوا تھا۔ وہی درحقیقت ایسا ماخذ اور سرچشمہ بن سکتا ہے جس سے ہمیشہ ہر زمانے کے لوگ اپنے مخصوص حال اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے علوم' افکار اور قوانین اخذ کرتے رہیں۔ جب تک علماء اسلام اس اصل ماخذ و منبع سے اکتسابِ علم کرتے رہے اور صحیح غور و فکر سے کام لے کر اپنے اجتہاد سے علمی مسائل حل کرتے رہے' اس وقت تک اسلام زمانے کے ساتھ حرکت کرتا رہا۔ مگر جب قرآن میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا گیا' جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہو گئی' جب آنکھیں بند کر کے پچھلے مفسرین اور محدثین کی تقلید کی جانے لگی' جب پچھلے فقہا اور متکلمین کے اجتہادات کو اٹل اور دائمی قانون بنا لیا گیا' جب کتاب و سنت سے براہِ راست اکتسابِ علم ترک کر دیا گیا' اور جب کتاب وسنت کے اصول کو چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے ہوئے فروع ہی اصل بنا لیے گئے تو اسلام کی ترقی دفعتاً رُک گئی' اس کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔

(اشارات' سیدابو الاعلیٰ مودودیؒ' ربیع الاوّل ۱۳۵۳ھ' مئی ۱۹۳۴ء)

حکمت عملی

بے شک میں نے ۱۹۴۰ میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک طریق کار پیش کیا تھا' مگر کیا یہ کوئی عقل مندی ہوتی کہ ۴۷ تک پہنچتے پہنچتے حالات میں جو عظیم تغیر رونما ہوگیا تھا اس کا ہم کوئی نوٹس نہ لیتے اور بدلے ہوئے حالات کو سمجھ کر اپنے ابتدائی طریقِ کار میں کوئی ردّوبدل نہ کرتے؟ بیشک میں نے اس طریقِ کار کو انبیاء کا طریقہ کہا تھا' اور آج بھی کہتا ہوں' مگر کسی صاحبِ عقل آدمی سے میں یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ ایک طریقِ کار کے بنیادی اصولوں اور حالات پر ان کے عملی انطباق کی مختلف اشکال کے درمیان فرق نہ کرے گا۔ اس طریقِ کار کے بنیادی اصول ہم نے کبھی نہیں بدلے' نہ انہیں بدلنے کے ہم قائل ہیں۔ لیکن جو شخص حالات اور مواقع اور ذرائع کی تبدیلی کے ساتھ ان اصولوں پر عمل درآمد کی شکلیں نہ بدل سکے اس کی مثال میرے نزدیک اس عطائی طبیب کی سی ہے جو کسی حکیم کی بیاض کا ایک نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کر کے تمام مریضوں پر اسے جوں کا توں استعمال کرتا چلا جائے۔ (آئندہ لائحہ عمل ص ۱۱۵-۱۱۷)

(بندۂ خدا)

حکمتِ مودودیؒ

تحریکِ اسلامی کا منصب' ایک آزمائش!

امارت کے اس منصب پر جس شخص کو فائز کیا جائے وہ مبارک باد کا مستحق نہیں ہوتا' بلکہ اظہارِ ہمدردی' رحم اور ترس کا مستحق ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے اوپر ایک ایسے کام کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس میں اگر اس سے کوتاہی ہو جائے یا ادائے فرض میں کسی حد تک بھی دانستہ خامی رہ جائے تو وہ دنیا میں ہی ارکان کے سامنے جوابدہ نہیں ہے' اور دنیا میں ہی جماعت کے لیے نقصان دہ نہیں' بلکہ آخرت میں بھی اس کے لیے جواب دہ ہے' اور کیونکہ اس جماعت نے یہ کام اپنے ذمے لیا ہے کہ خدا کے دین کو اس کی زمین پر عملاً قائم کیا جائے' اور اس راستے میں جو طاقتیں بھی حائل ہوں ان کا مقابلہ کیا جائے' ان کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جائے' (لہٰذا اس کا فرض ہے کہ) ان کی مزاحمت کرنے کی صورت میں جو آفت اور جو مصیبت بھی نازل ہو اس کو برداشت کرے اور عام ارکان سے زیادہ مصائب برداشت کرے۔ . .

اس موقعہ پر میں دو چیزوں کو الگ الگ بیان کروں گا۔ ایک' جماعت میں امیرِ جماعت کی ذمہ داری۔ دوسرے' جماعت میں کارکنوں اور ارکان کی ذمہ داریاں امیر کے ساتھ۔

امیرِ جماعت کی ذمہ داریاں

امیرِ جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہو' اور ان کے اوپر اس طرح حکم چلانے کی کوشش نہ کرے جس سے ان کے اندر ضد یا بددلی پیدا ہو' بلکہ دلی رفاقت' دلی محبت اور دلی خلوص کے جذبے سے ان کو متاثر کرے۔ ارکانِ جماعت اس کے حکم کے منتظر نہ رہیں' بلکہ اس کا منشا سمجھ کر ہی تعمیل کے لیے آمادہ ہوں۔ امیرِ جماعت کے حکم دینے کی بہت کم ضرورت پیش آئے۔

ارکانِ جماعت کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اس امر کا لحاظ رکھیں کہ ان کا امیر کیا چاہتا ہے' اور ان کو کس طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اس سے انحراف اگر درست ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ جب وہ شریعت کے خلاف کوئی بات کر رہا ہو' یا آپ محسوس کریں

کہ وہ مصلحت کے خلاف کام کر رہا ہے۔ ان دونوں چیزوں میں سے جس چیز کو بھی آپ محسوس کریں، آپ کا فرض ہے کہ امیرِ جماعت کے ساتھ اخلاص سے بات کر کے اس تک اپنا اعتراض پہنچائیں، اور امیرِ جماعت کا بھی فرض ہے کہ جب اس کو لوگوں میں اس کی کسی بات پر عدمِ اطمینان کا احساس ہو تو وہ انھیں مطمئن کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف قرآن میں یہ فرمائی گئی ہے کہ تم درشت خو ہوتے، سنگدل ہوتے، تو یہ مسلمان جو تمھارے گرد جمع ہوئے ہیں وہ تمھیں چھوڑ کر الگ ہو چکے ہوتے۔ اس میں اس چیز کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے کہ جماعت کے اندر اس کے رہنما کی حیثیت کیا ہونی چاہیے۔

اس کی حیثیت یہ ہونی چاہیے کہ:

وہ ارکانِ جماعت سے محبت کرے، اور ارکان اس سے محبت کریں۔

ارکانِ جماعت اس کے خلوص پر اعتماد کریں، اور وہ ارکانِ جماعت کے خلوص پر اعتماد کرے۔

اس کو جماعت کے اندر رحیم اور شفیق، ہمدرد اور مونس و غمخوار ہونا چاہیے۔

اپنی جماعت سے تعلق رکھنے والے ارکان اور کارکنوں کی ہر تکلیف میں اسے ان کا ساتھی ہونا چاہیے۔

امیرِ جماعت کے لیے ارکانِ جماعت بھی دعائے خیر کریں، اور وہ بھی ارکانِ جماعت کے لیے دعائے خیر کرے۔

ارکان اور کارکنوں کی ذمہ داریاں

جماعت کے ارکان اور کارکنوں سے میں کہوں گا کہ ان کا یہ کام ہے کہ وہ معروف میں اپنے امیر کی اطاعت کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ ایک اسلامی نظامِ جماعت میں جو شخص بھی امیر ہوتا ہے اگرچہ اس کو منتخب تو کرتے ہیں جماعت کے ارکان، لیکن حقیقت میں وہ جماعت کے اندر نائبِ رسول ہوتا ہے۔ اس لیے ان سب لوگوں پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں، اس کی اطاعت لازم ہے۔

یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ جماعتی فیصلے لازماً ہر شخص کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں کوئی جماعت بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر جماعتی فیصلے اس

جماعت کے ہر رکن اور ہر کارکن کو پسند ہوں اور اس کی پسند کے مطابق ہوں۔ لازماً کہیں نہ کہیں اختلاف یا ناراضی کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے، کہیں نہ کہیں آدمی غیر مطمئن ہوتا ہے، لیکن جب جماعتی فیصلہ ہو جائے اور امیر جماعت، جماعت کے نظم کے تحت ایک چیز کا فیصلہ کر لے، تو پھر چاہے وہ فیصلہ آپ کو ناگوار ہو یا خوشگوار، آپ کا کام یہ ہے کہ اس کی تعمیل کریں، اِلّا یہ کہ وہ معروف کے مطابق نہ ہو۔

معروف سے مراد ہے وہ نیکی اور وہ بھلائی جس کو ہر آدمی اپنے ضمیر میں جانتا ہے کہ یہ نیکی اور بھلائی ہے۔ اگر امیرِ جماعت معروف کے مطابق حکم دے رہا ہے، اور شریعت کے خلاف وہ حکم نہیں ہے، تو پھر اس کی پیروی کیجیے۔ البتہ اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ اس نے شریعت کے خلاف حکم دیا ہے تو پھر آپ کا فرض یہ ہے کہ آپ امیرِ جماعت سے بھی کہیں، مجلسِ شوریٰ میں بھی کہیں، مجلسِ عاملہ میں بھی کہیں کہ میرے نزدیک امیر کا فلاں حکم شریعت کے فلاں حکم سے ٹکراتا ہے۔ اگر وہ آپ کو مطمئن کر دے کہ وہ حکم شریعت کے حکم سے نہیں ٹکراتا تو پھر آپ کو تسلیم کرنے کے لیے سر جھکا دینا چاہیے ورنہ کوئی جماعت اور کوئی نظام جماعت بھی اپنا کام نہیں کر سکتا۔

اگر ہر آدمی کا رویہ یہ ہو کہ وہ امیرِ جماعت یا مجلسِ عاملہ یا شوریٰ کے فیصلوں پر محض اس بنا پر ناراض ہو کہ وہ فیصلے اسے پسند نہیں، اور وہ اس طرح اپنے اندر ناخوشی پیدا کرے جیسے اسے کوئی زخم آ گیا ہے، تو پھر کام نہیں چل سکتا۔

یہ چیز اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ آدمی جماعت میں داخل ہونے کے بعد اپنے دل سے کبر نہ نکال دے۔ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھنا ہی بیماری کی جڑ ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود بنی اسرائیل کی درخواست پر ان کے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا تو انھوں نے کہا کہ اس کو کہاں سے ہم پر حکمرانی کا حق پہنچتا ہے، ہم تو خود اس کے اہل ہیں۔ بس یہی کبر ہے، یہی کبرِ نفس ہے، یعنی اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھنا۔ کبرِ نفس اسلام کے راستے میں سب سے بڑا مانع ہوتا ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں بھی جن لوگوں کے اندر کبر تھا وہ اسلام میں آنے کے بعد پھر مرتد ہو گئے۔ اس لیے کہ حضورؐ کے احکام ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ہوتے تھے۔

جماعت کے ارکان کا یہ کام ہے کہ وہ کبر کو دل سے نکالیں۔ کبر کبھی ایسے شخص کے دل میں نہیں ہوتا ہے جو اپنی حقیقت کو جانتا ہو کہ میں کیا ہوں، کس طرح پیدا ہوا ہوں، میں کس

طرح بچے سے جوان ہوا ہوں اور جوان سے بوڑھا ہوا ہوں' اور میری کیا حیثیت ہے۔ اس دنیا کے اندر ایک ٹھوکر لگ جائے تو میں ختم ہو سکتا ہوں۔ ایسا آدمی اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے دماغ میں بڑائی کی ہوا پیدا نہیں ہو سکتی۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ کبریائی خدا کے سوا اور کسی کے لیے نہیں ہے۔ تو جب کبر نکل جائے گا' عاجزی پیدا ہوگی۔ انکسار آئے گا تو آدمی اپنی حقیقت کو خود سمجھ لے گا۔ عرفانِ نفس اس کو حاصل ہو گا۔ اس صورت میں وہ اطاعت سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ اگر جماعت کے ارکان کی اکثریت امیر پر مطمئن ہے' اور مجلسِ شوریٰ کی اکثریت امیرِ جماعت کے ساتھ ہم نوا ہو کر کوئی فیصلہ کرے' تو چاہے آپ کو گوارا ہو یا ناگوار' اس کی اطاعت کیجیے' اس کی پیروی کیجیے' اور اپنے آپ کو یہ نہ سمجھیے کہ باقی سب نالائق ہیں' ایک میں ہی لائق ہوں۔ اس لیے کہ یہ بڑائی کا خیال ہے۔ اسے اپنے دماغ سے نکال دیجیے۔

(۱۹۷۸ میں میاں طفیل محمد کی امیر جماعت اسلامی پاکستان کی حیثیت سے حلف برداری کے موقع پر)

فہم قرآن

نماز اور قربانی

حمید الدین فراہیؒ

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (الکوثر ۱۰۸: ۲)

ہم نے تجھے بخشا کوثر۔ پس اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھ اور اسی کے لیے قربانی کر۔

اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو کوثر' (یعنی خانہ کعبہ کے عطیہ) کی بشارت دینے کے بعد' دو باتوں کا حکم دیا: نماز اور قربانی۔ اور امر کے صیغہ پر تعقیب کی **ف** داخل کی۔ قواعد زبان کے اعتبار سے تعقیب کی **ف**' سابق ولاحق' یعنی عطیہ اور حکم' کے درمیان نسبت اور تعلق کی دلیل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہم نے نظم کلام پر غور کیا' اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ربط کے بعض پہلو معلوم ہوئے جو ذیل میں ہم بترتیب بیان کرتے ہیں۔

۱۔ اس حکم میں' بیت اللہ کی اس بخشش کا اصلی مقصود پنہاں ہے۔

کیونکہ یہ بخشش بہت بڑے مقصد کے لیے تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے'

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج ۲۲: ۴۱)

جو' اگر ہم ان کو زمین (مکہ) میں قبضہ دیں' تو نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' معروف کا حکم دیں گے' منکر سے روکیں گے۔

ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے فرمایا گیا ہے'

رَبَّنَآ اِنِّىْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِىْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِىْٓ اِلَيْهِمْ (ابراہیم ۱۴: ۳۷)

اے پروردگار ! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس بن کھیتی کی زمین میں، تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے پروردگار ! اس لیے کہ یہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے۔

اس سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے قدیم وطن سے ہجرت کرکے ایک بے آب و گیاہ سرزمین میں بسنا محض اس لیے تھا کہ اللہ واحد کی عبادت کا ایک مرکز تعمیر ہو، جو لوگوں کی عقیدت و انابت، سعی و طواف اور نذرونیاز کا قبلہ بنے، اور جس طرح غلام اپنے آقا کی ڈیوڑھی پر گوش برآواز سرگرم خدمت رہتے ہیں، اسی طرح لوگ اس گھر کی طرف لبیک لبیک، لاشریک لک لبیک، کہتے ہوئے بڑھیں، اور اپنے امام کی زبان سے گھر والے کے اوامر و نواہی سے آگاہ ہوں۔ اسی لیے فرمایا : وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ ، اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو کہ وہ تمہارے پاس آئیں۔ (الحج ۲۲ : ۲۷)

(یعنی تمہارے پاس حکمت و معرفت کی باتیں سننے آئیں۔ کیونکہ جس طرح مکہ لوگوں کے لیے مرکز اور سرچشمۂ برکت و ہدایت تھا، اسی طرح حضرت ابراہیمؑ لوگوں کے امام تھے۔ اس لیے آپ لوگوں کی میزبانی کرتے تھے، اور ان کی اصلاح و ہدایت کے لیے ان کے سامنے خطبہ دیتے تھے۔ ابتدائے بعثت میں آنحضرتؐ نے تبلیغ دین کے ارادہ سے اپنے خاندان کے لوگوں کی جو دعوت کی تھی وہ بھی اسی سنتِ ابراہیمی کی پیروی تھی۔ حج کے دوسرے مراسم کے ساتھ خطبہ کی یہ سنت بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد باقی رہی)۔

پھر نیاز کے جو جانور ساتھ لائے ہیں ان کا گوشت خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلائیں۔ اور شکر گزار ہوں کہ آقا نے خود اپنی بارگاہ میں پیش کرنے کے لیے سوغات بخشی، اور پھر خود اس کو قبول فرما کر غلاموں کو سرفراز فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس گھر کی تعمیر نہایت عظیم الشان مقاصد کے لیے ہوئی ہے، اور خدا نے انہی مقاصد کی خدمت اور تکمیل کے لیے آنحضرتؐ کو اس پر قبضہ دیا ہے۔ ان مقاصد کا لبِ لباب دو چیزیں ہیں : نماز اور قربانی۔ بس اس عطیہ کے ذکر کے بعد ان دونوں چیزوں کا ذکر کردیا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ عطیہ یوں ہی نہیں مل رہا ہے بلکہ اس کے کچھ حقوق و فرائض ہیں جن کا اہتمامِ اصلی مقصود ہے۔ یہ بقائے حقوق کے عام اور معروف قانون کے مطابق ایک مسلمہ حق کا اظہار کیا گیا ہے۔ کیونکہ کوئی عطیہ بغیر کسی فرض کی ذمہ داری کے نہیں ملا کرتا۔ جب ہم کچھ لے رہے ہیں تو لامحالہ ہم کو کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بھی آمادہ رہنا چاہیے۔۔۔

۲۔ بیت اللہ کے عطیہ کے ذکر کے بعد اس چیز کا ذکر کیا گیا ہے جو اس کے بقا و قیام کی بنیاد ہے، [یعنی نماز و قربانی -]

چنانچہ نماز اور قربانی کا حکم تمام امت کے لیے عام ہوا' کیونکہ [بیت اللہ کی] یہ نعمت بھی پیغمبرؐ اور آپؐ کی امت کے لیے عام تھی۔ پیغمبرؐ امت کا وکیل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جو کچھ اس کو ملتا ہے' اس میں امت بھی برابر کی شریک ہوتی ہے۔۔۔۔

جب کوئی عبادت کسی عطیہ کے ساتھ مخصوص کردی جائے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی پابندی ہی اس نعمت کے بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔۔۔۔

یہاں ' جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے' ہم کو حج اور اس کے دوسرے آداب و مناسک کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ "ہم نے تم کو کوثر بخشا" پس اس کے حقوق ادا کرتے رہو تاکہ یہ نعمت تمہارے لیے ہمیشہ باقی رہے۔ چاہے نماز اور حج کو الگ الگ لو یا دونوں کو ایک ساتھ لو' مراد اس سے حج ہی ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ حج نماز ہی میں سے ہے۔ حج کے اعمال و مراسم سے بھی اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے' اور یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ بیت اللہ کا مقصد نماز ہی ہے' اور اسی مقصد کے لیے اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے استطاعت کے باوجود اس گھر کا حج نہ کیا' اس نے اس کا مقصد پورا نہیں کیا۔

بعینہٖ یہی حال قربانی کا ہے۔ جس نے حج کی قربانی کی سعادت حاصل نہ کی' وہ درحقیقت اصلی قربانی سے محروم ہے۔ جو شخص اس قربانی کے علاوہ کوئی قربانی کرتا ہے' وہ حجاج سے صرف ایک گونہ مشابہت حاصل کرتا ہے' اور یہ قربانی کرکے گویا وہ ایک دن حقیقی قربانی کی سعادت کے حصول کی تمنا ظاہر کر رہا ہے۔

بہرحال ' جو پہلو بھی اختیار کرو' آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حج امت پر لازم ہے' اور جو شخص حج سے بے پروا ہوا' اس نے گویا اپنے آپ کو امت کے حلقہ سے الگ کرلیا۔۔۔۔

۳۔ اس میں پیغمبرؐ اور مسلمانوں کے لیے تسلی [کا سامان] ہے۔

گویا ان سے یوں کہا گیا ہے: "کفار نے تم کو جوارِ بیت اللہ سے جلاوطن کیا اور نماز و قربانی سے روکا لیکن اب کہ ہم تم کو کوثر بخشتے ہیں' پورے فراغِ خاطر اور ایک بڑی جماعت کے ساتھ اپنا حوصلہ پورا کرو۔" اس سے ایک طرف تو نماز' حج' قربانی اور دوسرے اعمالِ صالحہ کے لیے اس بے تابی کا اظہار ہو رہا ہے جو آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کو بے چین کیے ہوئے تھی' اور دوسری طرف اس میں بشارت' تسلی اور اظہارِ محبت کے بھی نہایت جاں نواز پہلو ہیں۔

۴ - یہ اس عہد کا بیان ہے جس کی ذمہ داری خدا کے عطیہ کے بعد از خود ہم پر عائد ہو جاتی ہے۔

کیونکہ نماز اور قربانی کے حکم کو خدا نے اپنے عطیہ کے ساتھ گویا مشروط کیا ہے' اس وجہ سے جب ہم نے خدا کا عطیہ قبول کرلیا تو لازماً اس حکم کو بھی اپنے اوپر واجب کرلیا۔ اور اس سے یہ بھی نکلا کہ جب تک ہم اس عہد پر قائم رہیں گے یہ عطیہ بھی ہمارے لیے باقی رہے گا۔

یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے جس طرح معاملہ آدم و حوا کے ساتھ ہوا تھا۔ خدا نے ان کو جنت میں سکونت اور ہر چیز سے آزادانہ فائدہ اٹھانے کی اجازت دی' لیکن ایک مخصوص درخت کے پاس جانے کی ممانعت کردی۔ جب انھوں نے خدا کے بخشے ہوئے عطیہ کو قبول کرلیا تو لازماً ان کے اوپر خدا کا یہ عہد بھی خود بخود واجب ہوگیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عہد ہی کے لفظ سے تعبیر فرمایا:

۵ - یہ عہد توحید کا بیان ہے۔

قرآن کے دلائل کا عام عنوان یہ ہے کہ وہ پروردگار ہے' اسی نے اپنی نعمتوں سے ہم کو مالا مال کیا ہے' اسی نے ہم کو خلعتِ وجود سے آراستہ کیا اور بہترین ساخت پر پیدا کیا' اور ہمارے لیے رزقِ طیب کا خوانِ کرم بچھایا۔ اس وجہ سے اسی کی عبادت اور اسی کی پرستش کرنی چاہیے۔

لیکن یہاں ایک مخصوص عظیم الشان نعمت کا ذکر ہے' اس وجہ سے توحید کا مطالبہ بھی اسی مخصوص پہلو سے کیا گیا ہے۔ یعنی جب خدا ہی نے ہم کو اس گھر کی خدمت و پاسبانی کی عزت بخشی ہے تو نماز و قربانی بھی اسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ یہ حقیقت اِنَّآ (بے شک ہم نے) اور لِرَبِّکَ (اپنے خداوند ہی کے لیے) کے الفاظ پر غور کرنے سے سامنے آتی ہے۔ یعنی ہم ہی نے تم کو بخشا ہے' اس وجہ سے تمہارا فرض ہے کہ مشرکین کے برخلاف صرف ہماری ہی نماز پڑھو اور ہمارے ہی لیے قربانی کرو۔

نماز اور قربانی میں مناسبت

صرف یہ بات کہ خدا نے نماز اور قربانی کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے' ہم کو دعوت دیتی ہے کہ ہم ان دونوں کی باہمی مناسبت پر غور کریں۔ اسی اشارے نے ہمارے سامنے بے شمار حقائقِ حکمت کی راہ کھولی ہے۔ ہم ان کو بیان کرتے ہیں تاکہ ایک طرف آیت کا حسنِ نظم واضح ہو' اور دوسری طرف ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ دیکھ سکیں کہ قرآن کی جو سورتیں اپنے الفاظ کے

اعتبار سے ایک قطرہ کی حیثیت رکھتی ہیں' وہ اپنے معانی کے اعتبار سے بحرِ بے کراں ہیں۔

۱۔ نماز اور قربانی میں وہی مناسبت ہے' جو مناسبت ایمان اور اسلام میں ہے۔

اس کی تفصیل سے پہلے ایک مختصر تمہید سن لینی چاہیے۔

دین کی بنیاد علم اور عمل کی صحت پر ہے۔ علم یہ ہے کہ ہم اپنے رب کو پہچانیں' اس کے ساتھ اپنے تعلق کو جانیں' اور پھر اس معرفت سے کبھی غافل نہ ہوں۔ اس علم سے لازماً محبت اور شکر کی ایک قلبی کیفیت و حالت پیدا ہوتی ہے۔ اسی قلبی کیفیت سے ایمان کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح گویا علم و عمل میں وہی تعلق ہے جو اثر اور مؤثر اور ظاہر اور باطن میں ہوتا ہے۔ یعنی علم ایمان سے تعلق رکھتا ہے اور عمل اسلام سے۔

پھر' ایک دوسری حقیقت پر غور کرو۔ عمل جس طرح علم کا مقابل ہے' اسی طرح قول کا بھی مقابل ہے' یعنی قول' علم و عمل کے بیچ کی کڑی ہے۔ قول' ارادہ کا اوّلین ظہور اور عمل کا عنوان و دیباچہ ہے۔

اس تمہید کی روشنی میں اب نماز اور قربانی کے باہمی تعلق پر غور کرو۔

نماز ظاہر ہے کہ قول و اقرار ہے۔ یہ اٹھنا' بیٹھنا' جھکنا' سجدہ کرنا' ہاتھ اٹھانا' انگلی سے اشارہ کرنا کیا ہے ؟ یہ سب اداؤں کی زبان سے ہمارا قول و قرار ہے۔ یہ ایمان کے بعد' راہِ اطاعت میں ہمارا پہلا قدم ہے۔ یہ اعمال کے دروازہ کی کلید ہے۔ اسی سبب سے یہ تمام شریعت کے دروازہ کا عنوان قرار دی گئی ہے۔ بہ کثرت آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔۔۔

حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں بھی اس حقیقت کی پوری تشریح ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اس کی صفتِ توحید کے ساتھ پہچان لینے کے بعد فرمایا'

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

(الانعام ۶: ۷۹)

میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رُخ اس ذات کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

اس آیت میں جس توجہ الی اللہ کا ذکر ہے نماز اسی توجہ الی اللہ کی عملی تصویر ہے۔ اسی وجہ سے ہماری نمازوں کا عنوان یہی مبارک آیت قرار پائی۔

یہی بات' ایک دوسرے مقام پر ابطال شرک کے بعد' آنحضرتؐ کو مخاطب کرتے ہوئے یوں فرمائی :

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ق وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (الروم ۳۰: ۳۰ - ۳۱)

اپنا رخ یکسو ہو کر دینِ الٰہی کی طرف سیدھا کرو۔ یہی اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اس میں فطرتِ الٰہی کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔ یہی فطرت کا سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہو، اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو۔ مشرکین میں سے نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز تمام مخلوقاتِ الٰہی کی فطرت ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل ۱۷: ۴۴)

ساتوں آسمان اور زمین، اور جو ان میں ہیں، اس کی تسبیح پڑھتے ہیں اور نہیں ہے کوئی شے مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح پڑھتی ہے۔

معلوم ہوا کہ تمام اعمال میں سے نماز، ایمان سے سب سے زیادہ قریب، بلکہ ایمان کا اولین فیضان ہے۔ اور اللہ تعالٰی کی تمام مخلوقات کی فطرت ہے۔ (گویا نماز حقیقتِ ایمان کی تصویر ہے)۔

اب قربانی کی حقیقت پر غور کرو۔ قربانی، حقیقتِ اسلام کی تصویر ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالٰی نے ہمارا امام، ان کی مسجد کو ہمارا قبلہ، اور ان کے طریقہ کو ہمارے لیے دستور العمل بنایا، تو ایک واقعہ بیان کر کے ہمارے لیے قربانی کی حقیقت بھی آشکارا کردی، جس سے ضمناً نماز کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے فرمایا،

اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ، میں اپنے پروردگار کی طرف جارہا ہوں، وہ میری رہبری فرمائے گا (یعنی میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں، وہ مجھ پر اپنی راہ کھولے گا)۔

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ، اے پروردگار مجھے صالحین میں سے بخش (یعنی اولاد صالح، تاکہ میں ان کو لے کر تیری راہ پر چلوں، اور لوگوں کے لیے حق و ہدایت کی راہ کھلے)۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ، پس ہم نے اس کو ایک حلیم لڑکے کی بشارت دی (یعنی حضرت اسماعیلؑ کی۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى، جب وہ اس عمر کو پہنچے کہ ان کے ساتھ دوڑ پھر سکیں۔ انھوں نے کہا، بیٹے میں نے خواب میں یوں دیکھا کہ تم

کو ذبح کر رہا ہوں (یعنی اللہ کے لیے)' اب تم بتاؤ تمھاری کیا رائے ہے؟ (یہ سوال اس لیے تھا کہ اس اطاعت میں فرمانبردار بیٹے کو بھی برابر کا شریک کرلیا جائے' کیونکہ حضرت ابراہیمؑ ہمیشہ کے لیے تسلیم و اطاعتِ الٰہی کی ایک راہ کھول رہے تھے' اور چونکہ اطاعت شعار فرزند دعا ہائے سحر کی قبولیت کے نتیجہ کے طور پر عطا ہوا تھا' اس وجہ سے اس کا عاقل اور حلیم ہونا معلوم تھا' یہ اندیشہ نہ تھا کہ اس کو اس امتحانِ بندگی میں شرکت سے انکار ہوگا)۔

قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ' انھوں نے جواب دیا' والد ماجد! جو حکم ملا ہے' اس کی تعمیل فرمائیے۔ ان شاء اللہ آپ مجھ کو ثابت قدموں میں پائیں گے۔ (یعنی حضرت اسماعیلؑ سمجھ گئے کہ ان کو حکمِ الٰہی کی تعمیل میں ذبح کیا جارہا ہے' اس وجہ سے انھوں نے وہ جواب دیا جو متوکلین کے شایانِ شان تھا)۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ' پس جب دونوں امرِ الٰہی کے سامنے جھک گئے اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔ (یعنی اس طرح دونوں نے اپنے کمالِ اطاعت و اسلام کو آشکارا کردیا۔ کیونکہ باپ نے اس چیز کو قربان کرنے کا عزم کرلیا جو اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی' اور بیٹے کی تو کل کائنات صرف اس کی جان ہی تھی)۔

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗـؤُا الْمُبِيْنُ ' اور ہم نے اس کو پکارا' اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ بے شک ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ بلاشبہ کھلی ہوئی جانچ یہی ہے۔ (اس اطاعتِ کاملہ نے ان کو درجۂ احسان کی سرفرازی بخشی' اور یہی کمالِ اسلام ہے۔ اس امتحان کے بعد ان دونوں کو خدا نے قوموں کا امام اور ہادیوں کا رہبر بنایا)۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ' اور ہم نے اس کو بڑی قربانی کے عوض چھڑا لیا (الصّٰفّٰت ۳۷: ۹۹ تا ۱۰۷)۔ (یعنی اس قربانی کی یادگار میں' قربانی کی ایک عالمگیر اور عظیم الشان سنت قائم کردی' جو قربانی کرنے والوں کی مغفرت کا وسیلہ ہے)۔

اس سرگزشت میں خدا نے ہمارے سامنے یہ حقیقت کھولی ہے کہ اسلام کی روح' خدا کی اطاعت اور اپنی عزیز سے عزیز متاع حتیٰ کہ جان کو بھی خدا کے حوالہ کردینا ہے۔ اور یہ بات بغیر کامل ایمان و اخلاص کے پیدا نہیں ہوسکتی۔ پس گویا ان دونوں کا رتبۂ کمال مقامِ احسان ہے۔ احسان کی حقیقت یہ ہے کہ اعبد ربک کانک تراہ (اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو)۔ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی اور نماز میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایمان و

اسلام میں یا قول اور عمل میں ہے' اور احسان ان دونوں کا نقطۂ اتصال ہے۔

۲- نماز اور قربانی میں وہ نسبت ہے' جو نسبت زندگی اور موت میں ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نماز کی حقیقت یادِ الٰہی ہے۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ' اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو (طٰہٰ ۲۰:۱۴)۔

ذکر سے مقصود دوام ذکرِ الٰہی ہے۔ چنانچہ فرمایا : اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ' جو اللہ کو یاد کرتے ہیں' کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (آل عمران ۳ : ۱۹۱)۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا ○ وَّسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا ○ ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ط وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ○ (الاحزاب ۳۳ : ۴۱ - ۴۳)

اے ایمان والو ! اللہ کو بہت یاد کرو' اور صبح و شام اس کی تسبیح پڑھو۔ وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں۔ تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جائے اور وہ مومنین پر مہربان ہے۔

یعنی جس طرح تم اس کی یاد کرتے ہو' اور اس کی تسبیح پڑھتے ہو' اسی طرح وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں جس سے تمہاری روشنی بڑھتی ہے۔ چنانچہ فرمایا :

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (البقرہ ۲ : ۱۵۲)

پس مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔

یہی راز ہے کہ ہمارے رات دن کے تمام اوقات نمازوں سے گھیر دیے گئے ہیں اور کسی حال میں بھی اس سے معافی نہیں دی گئی ہے۔ نماز سانس کی طرح زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ حقیقی زندگی جو نور' سکینت اور ایمان کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے' صرف اللہ کی یاد سے باقی رہ سکتی ہے۔

غور کرو تو عقلاً" یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ بندوں کو عقل و تمیز کی صلاحیت بخش دینے کے بعد' خدا کی نظرِ کرم ان کی طرف اس وقت تک ملتفت نہیں ہونی چاہیے جب تک وہ اپنی توبہ و انابت سے اس کو دعوت نہ دیں۔ اس کا دستور ہے کہ جب بندہ شکر کرتا ہے اور پائی ہوئی نعمتوں کو کام میں لاتا ہے تو وہ نعمت کو زیادہ کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی ' (محمد ۴۷ : ۱۷) جو طلب ہدایت میں سرگرم رہتے ہیں۔ ان کے نورِ ہدایت کو بڑھاتا ہے۔

توجہ الی اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے نام کی یاد کی جائے۔ خدا سے قرب حاصل کرنے کی راہ یہی ہے۔ اللہ سے قربت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کو یاد رکھا جائے اور اس سے دوری کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد سے غفلت ہو جائے (اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْھَا)۔ جب بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو اس سے قریب ہو جاتا ہے' جیسا کہ فرمایا ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ○ (العلق ۹۶: ۱۹)

سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔

اس وقت اللہ کی نظرِ رحمت اس کو نوازتی ہے۔ اس کا سینہ انوار و تجلیاتِ الٰہی سے جگمگا اٹھتا ہے۔ اور اس کی روح ذکر و فکر کی گہرائیوں میں جس قدر اترتی جاتی ہے' زندگی اور قوت کے لازوال خزانوں سے اسی قدر قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں اسی حقیقت کی خبر دی گئی ہے:

بندہ نوافل کی راہ سے میری طرف بڑھتا رہتا ہے' یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں۔ اور جب میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں' تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔

یہ اسی روحانی زندگی کا بیان ہے' جو حقیقی اور واقعی زندگی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز حقیقی زندگی کا سرچشمہ اور اس حیات سفلی سے نجات حاصل کرنے کا زینہ ہے۔

اب قربانی کی حقیقت پر غور کرو۔ اس کا اصلی مفہوم' جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی سرگزشت سے ظاہر ہے' نفس کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا ہے۔ یہ تسلیم و اطاعت کے ایک عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے۔ اس میں اس زبردست امتحان کی سرگزشت پنہاں ہے جس میں خدا نے ابراہیمؑ خلیل کو ڈالا تھا۔ اہل ایمان' راہ الٰہی میں اپنی جانیں قربان کرکے' اسی اطاعت و عبدیت کی یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ پس جس طرح نماز اللہ کے ساتھ ہماری زندگی ہے' اسی طرح قربانی اس کی راہ میں ہماری موت ہے۔ اور یہی حقیقی دین اور حقیقی اسلام ہے۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

(الانعام ۶ : ۱۶۱-۱۶۲)

کہہ دو میرے رب نے مجھ کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ سیدھے دین' دینِ ابراہیم کی' جو صرف اللہ کا پرستار تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ کہہ دو میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں "نسک" سے مراد حج اور عمرہ میں قربانی کرنا ہے۔ لغت عرب سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں "صلوۃ اور "نسک" کو ایک ساتھ رکھا ہے' اور اس کے بعد علی الترتیب "محیا اور ممات" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ نظم کلام' توافق کے اصول پر' ان دونوں کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق کو بے نقاب کر رہا ہے۔ یعنی نماز' مسلم کی زندگی ہے' اور اس کی قربانی' راہِ الٰہی میں اس کی موت ہے۔ پھر غور کرو تو یہ دونوں بالکل ایک ہیں' کیونکہ یہ موت ہی حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (البقرہ ۲ : ۱۵۴)

جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں' ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں' لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔

۳ - نماز اور قربانی "حقیقی قربانی" کے دو بازو ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے جب انسان کو صاحبِ عقل و ارادہ اور خیر و شر میں تمیز کرنے والا بنایا' تو ایک طرف تو اس کو عظمت و رفعت کا وہ مقامِ بلند بخش دیا جس سے برتر اور بلند کوئی اور مقام نہ تھا۔ دوسری طرف اس کو ذلت و پستی کے اس کنارہ پر کھڑا کر دیا' جس سے بڑھ کر کوئی ذلت و پستی نہ تھی۔

چنانچہ بندہ جب اس منعم حقیقی سے بے پروا ہو جاتا ہے' تو جمالِ الٰہی کی روشنی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے' اور وہ باطل کے دامِ فریب میں پھنس کر اپنے آپ کو ہوائے نفس کے حوالہ کر دیتا ہے۔

(جب اس نے خدا سے منہ پھیر لیا' اور اپنے نفس کا غلام بن گیا' تو خدا نے اس کو اس کی خواہشوں کے حوالے کر دیا جو اس کے قلب کے لیے حجاب بن گئی ہیں)۔

كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ۝ (المطففین ۸۳ : ۱۴ - ۱۵)

ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی جم گئی ہے' ہرگز نہیں! وہ اس

دن اپنے پروردگار کے دیدار جمال سے محروم ہوں گے۔

یعنی جس طرح وہ اس حیات دنیوی میں خدا کے نور ایمان سے محروم تھے' اسی طرح حیات اخروی میں اس کے دیدار جمال سے محروم ہوں گے۔ آدمی جو کچھ چاہتا ہے خدا کی طرف سے وہی اس کو ملتا ہے۔ جنھوں نے نفس اور شہوات نفس کی غلامی پسند کی' وہ نفس کے غلام بن گئے' اور قیامت کے دن اپنے نفس کی حقیقت سے دوچار ہوں گے' جس کا بیان یوں کیا گیا ہے کہ **ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ**' پھر وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔ (المطففین ۸۳: ۱۶)

چنانچہ انسان کے لیے ضروری ہوا کہ وہ نفس کے صنم اکبر کو توڑے۔ اور نفس کی حقیقت پر جن لوگوں نے غور کیا ہے' ان کو معلوم ہے کہ نفس کے دو بازو ہیں: سبعیت اور بہیمیت۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ انسان کو ان دونوں بازوؤں کے توڑنے کی تدبیر بتائی جائے۔

(۱) اول' یعنی سبعیت کے توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ اللہ کے حضور خشیت و تذلل کے ساتھ نماز کی پابندی کی جائے۔ نفس کے کبر و نخوت کا سر صرف نماز ہی سے کچلا جاسکتا ہے۔ کیونکہ خشوع' نماز کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔ ان آیات پر غور کرو۔

وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ○ اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ ○ (الاعراف ۷: ۲۰۵-۲۰۶)

اپنے رب کو دل میں یاد کرو' گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور پست آواز میں صبح اور شام' اور بے خبروں میں سے مت بنو۔ جو لوگ تمھارے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی سے اباء نہیں کرتے۔ اور اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ○ (الفرقان ۲۵: ۶۳-۶۴)

اور خدائے رحمٰن کے بندے وہ ہیں' جو زمین پر خاکساری کے ساتھ چلتے ہیں' اور جب جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام! اور جو اپنی راتیں خدا کے حضور سجدہ و قیام میں بسر کرتے ہیں۔

[یہاں] نماز سے پہلے ان کی خاکساری کا تذکرہ کیا ہے' کیونکہ نماز کی حقیقت نفس کو نخوت سے پاک کرنا ہے' جو لوگ برابر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں اور خدا کے جلال و جبروت اور اس

کی نعمت و رحمت کی یاد تازہ رکھتے ہیں' ان کے چہروں سے تواضع اور محبت کا جمال ٹپکتا رہتا ہے۔
(۲) دوسرے بازو یعنی بہیمیت کے توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ نفس اس دنیا کی جن مرغوبات میں لذت پاتا ہے ان سے اس کو علیحدہ کیا جائے۔ اس کے تین درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان قربان کی جائے۔ اس کا بلند ترین مقام لختِ جگر کی قربانی ہے۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کو ان کے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے حکم سے جانچا گیا' جو ان کی محبوب ترین اولاد تھے۔ ان کے محبوب ترین ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب فرشتہ نے حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوش خبری دی تو انھوں نے کہا' اسمٰعیل زندہ رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ کس قدر والہانہ محبت تھی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اطاعتِ الٰہی کی راہ میں مصائب و آلام جھیلے جائیں' اور لذات سے کنارہ کشی اختیار کی جائے' کیونکہ زندگی کے بعد نفس کو سب سے زیادہ محبوب لذات ہی ہیں۔ روزہ اس منزل میں بہترین رہبر ہے۔ مقامِ قربانی کے مدارج میں سے ضعفاءِ طریق کی پہنچ اسی حد تک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ سب سے بلند درجہ کے حصول کی راہ کیا ہے' تو انھوں نے فرمایا: یہ روزہ اور نماز سے حاصل ہوتا ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ مال کو' جو تمام لذات کے حصول کا ذریعہ ہے' خدا کے راستہ میں خرچ کیا جائے۔ اس منزل میں رہبر زکوٰۃ ہے۔ متعینہ زکوٰۃ سے زیادہ خرچ کرنے میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو چیز غرور کا سبب ہوتی ہے آدمی اس کو خدا کی راہ میں لٹا دیتا ہے۔ پھر چونکہ مقصود ذبحِ بہیمیت سے نفس کو ان چیزوں کی غلامی سے چھڑانا ہے جن کی لذتیں اس پر گھیرے ڈال رہی ہیں' اس وجہ سے ضروری ہوا کہ خدا کی راہ میں وہ چیز خرچ کی جائے جو نفس کو محبوب ہو۔ چنانچہ اسی سبب سے فرمایا ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران ۳: ۹۲)

تم اس وقت تک وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کرسکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو' جو تمھیں محبوب ہیں۔

یہ جو قربانی کے جانوروں کو فربہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے' اس میں بھی یہی حکمت ہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو محبوب ترین اولاد کے ذبح کا حکم دے کر تو یہ حقیقت بالکل ہی آشکارا کردی گئی ہے۔ نیز چونکہ قربانی کا حقیقی مرتبہ کمالِ جان کی قربانی تھا' اس وجہ سے خون بہانا اس کی اصل علامت قرار پایا۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نماز اور قربانی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ذبح نفس کے دو پہلو ہیں' ایک حدیث میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ **قربان ہذہ الامہ بد مانہا وصلوتہا'** اس امت کی قربانی' بذل نفس اور نماز کے ذریعہ سے ہے۔

۴ - نماز اور قربانی دونوں ایک دوسرے پر مشتمل ہیں۔

یعنی نماز ایک پہلو سے قربانی ہے' اور قربانی ایک دوسرے پہلو سے نماز ہے۔ نماز کا قربانی ہونا واضح ہے۔ البتہ قربانی کا نماز ہونا محتاج تفصیل ہے۔

یہ بات گزر چکی ہے کہ قربانی کی حقیقت' راہِ الٰہی میں جان کی قربانی ہے۔ اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ یہ ایک دوسری صورت میں بعینہ نماز ہے۔ نماز میں زبان اور اداؤں کے ذریعہ سے ایمان کا اقرار کیا جاتا ہے' اور قربانی میں اسی ایمان کی تصدیق جان دے کر کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے خدا کی راہ میں جان دینے کا نام شہادت ہوا۔ نیز قربانی میں کمال درجہ خضوع اور اطاعت ہے۔ اس وجہ سے نماز کی اصلی روح' اقرارِ توحید اور خضوع' کی یہ سب سے زیادہ حامل ہے۔ علاوہ ازیں اس کے تمام آداب بھی اس کے نماز ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً

الف - قربانی خانہ کعبہ کے پاس ہوتی ہے' جو مرکز نماز ہے۔

ب - اس کا آغاز بسم اللہ و اللہ اکبر سے ہوتا ہے۔

ج - قربانی اور قربانی کرنے والے دونوں کا رخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔

د - اونٹوں کو کھڑے کر کے قربان کیا جاتا ہے' جس میں قیامِ نماز کی جھلک پائی جاتی ہے۔

ھ - مینڈھوں کو لٹا کر قربان کیا جاتا ہے' جس کو سجدۂ نماز سے مشابہت ہے۔

پھر آغازِ نماز کی دعا جو قرآن میں وارد ہے' وہی دعا قربانی کے وقت بھی پڑھی جاتی ہے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ (الانعام ۶ : ۷۹)

میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا' اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْكَ لَهٗ (الانعام ۶ : ۱۶۲ - ۱۶۳)

بے شک میری نماز' میری قربانی' میری زندگی' میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے' اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔ چنانچہ ابراہیمؑ ـــ واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ○ (الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۰۳)

جب ان دونوں نے امرِ الٰہی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔

یعنی ان کے ظاہر و باطن دونوں خدا کی طرف متوجہ ہو گئے' اور ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو سجدہ میں ڈال دیا۔

اسی طرح قربانی کے ذکر میں فرمایا:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ (الحج ۲۲: ۳۶)

اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں سے قرار دیا۔ ان میں تمہارے لیے فوائد ہیں۔ پس ان پر اس حال میں' کہ وہ صف بستہ ہوں' اللہ کا نام لو۔

یعنی جس طرح تم نمازوں میں صف بستہ کھڑے ہوتے ہو' اسی طرح وہ بھی ذبح کے وقت قطار میں کھڑے کیے جائیں۔

۵ - نماز اور قربانی' دونوں' ذکر الٰہی ہیں۔

نماز کا ذکر ہونا تو متعدد آیات سے واضح ہے۔ رہا قربانی کا ذکر ہونا' تو یہ بھی قرآن سے ثابت ہے۔ فرمایا:

لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (الحج ۲۲: ۳۴)

تاکہ اللہ کے نام کو یاد کریں' ان چوپایوں پر جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (الحج ۲۲: ۳۷)

اسی طرح ان کو تمہارے لیے مسخر کیا تاکہ تم اس ہدایت پر جو اللہ نے تم کو بخشی ہے' اس کی بڑائی کرو (یعنی دینِ توحید اور اسلام کے دیے جانے پر)۔

اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح تکبیر کے ذریعہ سے ہم نماز میں اللہ کی بڑائی بیان کرتے ہیں بعینہ اسی طرح قربانی کے وقت بھی کرتے ہیں۔

۶ - نماز اور قربانی' دونوں شکر ہیں۔

نماز کا شکر ہونا تو بالکل ظاہر ہے' یہاں تک کہ بعض جگہ نماز کو تعبیر ہی شکر کے لفظ سے کردیا گیا ہے۔ . . . سورۂ فاتحہ نماز کی جان ہے' اور معلوم ہے کہ اس سورہ کی بنیاد شکر ہی پر ہے۔

اب قربانی پر غور کرو۔ یہ بات بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ تعالٰی دنیا اور دنیا والوں سے بالکل مستغنی ہے۔ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ' وہ کھلاتا ہے لیکن کھاتا نہیں۔ (الانعام ۶: ۱۴) اس نے جو نعمتیں ہم کو بخشی ہیں' ان میں سے کچھ ہم اس کی راہ میں محض اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے قربان کرتے ہیں' کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت اور اسی کا انعام ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے قربانی کے وقت ہم یہ الفاظ کہتے ہیں: منک ولک' تیری ہی بخشی ہوئی نعمت اور تیری ہی راہ میں۔ اسی وجہ سے فرمایا ہے: كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' اسی طرح ہم نے ان کو مسخر کیا' تاکہ تم شکر کرو (الحج ۲۲: ۳۶)۔

اور جس طرح نماز اللہ کی تمام ظاہری و باطنی نعمتوں پر ایک عام شکر ہے' اسی طرح قربانی بھی محض منافع دنیاوی کا شکر نہیں ہے بلکہ عمومی شکر کا وہی پہلو اس میں بھی ملحوظ ہے جو نماز میں ملحوظ ہے۔

۷ - نماز اور قربانی دونوں تقویٰ کی فرع ہیں۔

یہ قاعدہ ہے کہ جس سے آدمی کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں' یا جس سے وہ ڈرتا ہے' اس کو برابر یاد رکھتا ہے۔ نماز اسی ذکر کے قائم رکھنے کے لیے ہے۔ چونکہ بندہ کو خدا کی رضا مطلوب ہوتی ہے اور وہ اس کے غضب سے ڈرتا ہے' اس وجہ سے وہ اس کے سامنے روتا اور گڑگڑاتا ہے۔ . . .

اب قربانی کو دیکھو۔ اللہ تعالٰی نے چوپایوں پر انسان کو جو غلبہ اور تسلط دیا ہے' اس میں ایک قسم کی آقائی اور بندگی کی نمود ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اظہارِ خشوع اور اقرارِ بندگی کے ذریعہ سے اس غرور کو مٹا دیا جائے' اور قربانی کے وقت بندہ کی زبان پر شکرِ نعمت اور اقرارِ عبدیت کے ایسے الفاظ جاری کیے جائیں جن سے خدا کی ملکیت اور پروردگاری اور اس کی وحدت و یکتائی کا اظہار ہو۔

غور کرو ان تمام باتوں میں تقویٰ کی کس قدر جلوہ گری ہے۔ تقویٰ ہی چونکہ ان تمام حقائق کا جامع تھا' اس وجہ سے وہی قربانی کی حقیقت قرار پایا۔ بندہ تقویٰ کی ہی راہ سے قربِ الٰہی کے مرتبہ کو پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے کوئی قربانی اس وقت تک قبول نہیں ہوتی' جب تک اس میں تقویٰ نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا: اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ' اللہ صرف متقین کی قربانی قبول کرتا ہے

(المائدہ ۵ : ۲۷)۔

۸ ۔ نماز اور قربانی منازلِ آخرت میں سے ہیں۔

نماز رجوع الی اللہ اور حشر میں پروردگار کے حضور ہمارے کھڑے ہونے کی تصویر ہے۔ گویا بندہ جس وقت نماز میں کھڑا ہوتا ہے اس وقت وہ خدا کے سامنے حاضری کے دن کو یاد کر رہا ہوتا ہے۔ یہ اشارہ مندرجہ ذیل آیت سے نکلتا ہے :

اِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ۝ الَّذِينَ يَظُنُّونَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُونَ ۝
(البقرہ ۲ : ۴۵ - ۴۶)

بے شک وہ (نماز) گراں ہے، مگر ان خوف رکھنے والوں پر جن کو گمان ہے کہ ان کو اپنے رب سے ملنا ہے اور ایک دن وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

جن لوگوں کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ایک دن خدا کی طرف لوٹنا اور اپنے تمام اعمال و اقوال کی جواب دہی کرنی ہے، وہ تمام غفلتوں اور گناہوں سے تائب ہو کر لازماً اللہ کی طرف جھک جاتے ہیں۔ اور جو خشیت اور پستی خدا کے سامنے آخرت میں ان پر طاری ہونے والی ہے، اس کا عکس دنیا ہی میں ان پر نظر آنے لگتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ خدا حشر کے دن جب ہم کو پکارے گا تو ہم اس کی حمد پڑھتے ہوئے قبروں سے نکل کر اس کی طرف بھاگیں گے۔ اسی طرح نمازی نماز کی پکار کی طرف لپکتے ہیں، اور صف بستہ ہو کر خدا کی حمد کرتے ہیں۔

بعینہٖ یہی حقیقت قربانی میں بھی جلوہ گر ہے۔ وہ بھی نماز کی طرح رجوع الی اللہ ہے۔

جس طرح چوپایوں کو خدا نے ہمارے لیے مسخر کیا ہے، اسی طرح ہمارے جسموں کو بھی ہمارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ ایک معین مدت تک کے لیے نرمی اور حسن سلوک کے ساتھ ہم ان کو اپنا مرکب بنائیں اور پھر ان کو خدا کے حوالے کر دیں۔ جس طرح قربانی کے جانوروں کو ہم بیت اللہ کی طرف لے جاتے ہیں، اسی طرح اپنے اجسام کو بھی لے جاتے ہیں :

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، کہ آویں تمہارے پاس پیادہ پا اور لاغر اونٹوں پر جو آئیں گے گہرے راستوں سے۔

دیکھو، ہمارے جسموں اور ہمارے چوپایوں کے لیے سمتِ سفر ایک ہی معین ہوئی۔ اور یہ اشتراک ہر چیز میں نمایاں ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ ہم جانوروں کی طرح اپنے جسموں کو ذبح نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح حضرت اسماعیلؑ کی جان اس چیز کے عوض چھڑا لی گئی جو

ان کی قائم مقام بن کر قربان ہوئی' اسی طرح ہم جانوروں کے فدیہ کے عوض اپنی جانوں کو چھڑا لیتے ہیں۔ لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیلؑ کا ہدیہ ایک دوسری شکل میں قبول فرمایا کہ حضرت اسماعیلؑ کو اپنے گھر کی خدمت کے لیے مخصوص فرما لیا' اسی طرح ہم بھی اپنی جانوں کو فدیہ دے کر چھڑا تو لیتے ہیں لیکن وہ ہم کو واپس نہیں کر دی جاتی ہیں' بلکہ وہ ہماری امانت میں دے دی جاتی ہیں تاکہ جب ضرورت پیش آئے ہم اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر سکیں۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (التوبہ ۹ : ۱۱۱)

بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کا مال جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں' پس قتل کرتے ہیں اور شہید ہوتے ہیں۔

پیروی اسلام کا عہد کر لینے کے بعد ہم خدا کے ہاتھ بک جاتے ہیں' اسی عہد کی تجدید کے لیے ہم اس کے آستانہ پر حاضر ہوتے ہیں اور حجرِ اسود کو ہاتھ لگا کر اس عہد کو از سرِ نو تازہ کرتے ہیں۔ یہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے عہد کی ہماری طرف سے توثیق اور اللہ کی راہ میں قربان ہونے کے لیے ہماری طرف سے اقرار ہوتا ہے۔

پھر حج کا اجتماع میدانِ حشر میں ہمارے کھڑے ہونے کی بھی تصویر ہے۔ اس پہلو سے نماز' حج اور قربانی' ان تینوں کو آخرت سے نہایت قریبی نسبت ہوئی۔

۹ ۔ نماز اور قربانی' ابوابِ صبر میں سے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کے وعدہ پر پورا بھروسہ کر کے نماز کی پابندی کرتا ہے' اس کی مثال اس درخت لگانے والے کی ہے جو شب و روز اپنے لگائے ہوئے پودے کی نگہداشت کرتا ہے' اس کی خدمت کرتا ہے' اس کو پانی دیتا ہے' اور اس کے پھل لانے کا منتظر ہے۔ دوسروں کی غفلت و سرمستی' اس کی اس سرگرمی و خود فراموشی میں کوئی کمزوری نہیں پیدا کرتی۔ لوگ اس کی امیدِ موہوم پر ہنستے ہیں' لیکن وہ خدا کی شکرگزاری اور اطاعت کے جس جادۂ مستقیم پر چل رہا ہے برابر اس پر سرگرمِ سفر ہے' اور لوگوں کے ہنسنے اور مذاق اڑانے سے اس کی ہمت پست نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے یہ باتیں اس وقت تک نہیں ہو سکتیں جب تک آدمی میں ارادہ کی غیر معمولی پختگی اور انجام کار کی کامیابی کا غیر متزلزل یقین نہ ہو۔ چنانچہ اسی وجہ سے قرآن مجید نے صبر اور نماز کو متعدد آیات میں ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔۔۔۔ اللہ کے عہد پر قائم رہنا' اس پر

کہ وہ مصلحت کے خلاف کام کر رہا ہے۔ ان دونوں چیزوں میں سے جس چیز کو بھی آپ محسوس کریں' آپ کا فرض ہے کہ امیرِ جماعت کے ساتھ اخلاص سے بات کر کے اس تک اپنا اعتراض پہنچائیں' اور امیرِ جماعت کا بھی فرض ہے کہ جب اس کو لوگوں میں اس کی کسی بات پر عدمِ اطمینان کا احساس ہو تو وہ انھیں مطمئن کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف قرآن میں یہ فرمائی گئی ہے کہ تم درشت خو ہوتے' سنگدل ہوتے' تو یہ مسلمان جو تمھارے گرد جمع ہوئے ہیں وہ تمھیں چھوڑ کر الگ ہو چکے ہوتے۔ اس میں اس چیز کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے کہ جماعت کے اندر اس کے رہنما کی حیثیت کیا ہونی چاہیے۔

اس کی حیثیت یہ ہونی چاہیے کہ:

وہ ارکانِ جماعت سے محبت کرے' اور ارکان اس سے محبت کریں۔

ارکانِ جماعت اس کے خلوص پر اعتماد کریں' اور وہ ارکانِ جماعت کے خلوص پر اعتماد کرے۔

اس کو جماعت کے اندر رحیم اور شفیق' ہمدرد اور مونس و غمخوار ہونا چاہیے۔

اپنی جماعت سے تعلق رکھنے والے ارکان اور کارکنوں کی ہر تکلیف میں اسے ان کا ساتھی ہونا چاہیے۔

امیرِ جماعت کے لیے ارکانِ جماعت بھی دعائے خیر کریں' اور وہ بھی ارکانِ جماعت کے لیے دعائے خیر کرے۔

ارکان اور کارکنوں کی ذمہ داریاں

جماعت کے ارکان اور کارکنوں سے میں کہوں گا کہ ان کا یہ کام ہے کہ وہ معروف میں اپنے امیر کی اطاعت کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ ایک اسلامی نظامِ جماعت میں جو شخص بھی امیر ہوتا ہے اگرچہ اس کو منتخب تو کرتے ہیں جماعت کے ارکان' لیکن حقیقت میں وہ جماعت کے اندر نائبِ رسول ہوتا ہے۔ اس لیے ان سب لوگوں پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں' اس کی اطاعت لازم ہے۔

یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ جماعتی فیصلے لازماً ہر شخص کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں کوئی جماعت بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر جماعتی فیصلے اس

اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا اقرار جاری کیا۔ یعنی ہم اور ہماری تمام ملکیت خدا ہی کے لیے ہیں۔ حکومت اور احسان صرف اسی کی صفت ہے' ہمارے لیے صرف اطاعت اور شکر گزاری ہے۔ جس طرح ملکیت صرف مالک کی طرف لوٹتی ہے' اسی طرح ہم کو بالآخر خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیے کسی چیز سے بھی' یہاں تک کہ اپنے نفس سے بھی' متمتع ہونا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک ہم اس کا نام لے کر' اس کی بخشش کا اقرار نہ کرلیں۔ اسی چیز کی تعلیم کے لیے اس نے ہمارے لیے قربانی کا فریضہ ٹھہرایا' تاکہ جو انعام و بہائم اس نے ہمارے لیے مسخر کیے ہیں ہم ان کو اس کے نام پر قربان کریں۔

چونکہ ہمارے قبضہ میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے' اس وجہ سے اسراف ناجائز ہوا اور چونکہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی ملکیت کی سب سے بڑی شہادت دی' یہاں تک کہ اپنی جان اور اپنے محبوب لختِ جگر کو بھی اس کی راہ میں پیش کردیا' اس وجہ سے قربانی کے بیان کے لیے انھی کا نمونہ مثال قرار دیا گیا' کیونکہ خدا کی امانت خدا کے حوالہ کرنے کی اس سے بڑھ کر کوئی اور مثال نہیں تھی۔

۱۱۔ نماز اور قربانی' یہ دونوں تقرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے۔ نماز کی سب سے زیادہ نمایاں حقیقت توجہ الی اللہ ہے۔ جو شخص نماز میں ہے وہ گویا اپنے رب کے حضور کھڑا ہے اور اس سے مناجات و گفتگو کررہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دہنے بائیں کسی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ نماز نہ صرف ذریعۂ تقرب بلکہ عین تقرب ہے۔ یہ آیت اس کی دلیل ہے۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ "۔ میرے خیال میں عربی میں صلوٰۃ کا اصلی مفہوم بھی قربت قریبہ ہی کا ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف بڑھنا اور اس میں داخل ہو جانا۔ اسی لیے گھوڑ دوڑ کے اس گھوڑے کو جو اگلے گھوڑے کے بعد ہو مصلی کہتے ہیں۔ جو شخص آگ کے پاس نہایت قریب ہو کر تاپ رہا ہو' اس کو صالی کہتے ہیں۔ یہی لفظ اس شخص کے لیے بھی استعمال کیا جائے گا جو آگ میں گھس جائے۔

بعینہٖ یہی حقیقت قربانی میں بھی مضمر ہے۔ قربانی کرنے والا اپنی قربانی ایسی جگہ لاتا ہے' جو اس کے خیال میں خدا کی طرف سے اس عبادت کے لیے مخصوص اور مقدس ہوتی ہے۔ یہود کے یہاں بیت المقدس کے سوا کسی دوسری جگہ قربانی جائز نہیں۔ لیکن مسلمانوں کے لیے جس طرح تمام روئے زمین کو مسجد ہونے کا شرف حاصل ہوا' اسی طرح قربانی بھی ان کے لیے ہر جگہ جائز ہوئی۔ تاہم جس طرح مسجد کی نماز کو فضیلت حاصل ہے' اسی طرح قربان گاہ پر قربانی کرنا بھی

افضل ہے۔ چنانچہ جس طرح ہم ان کی تعمیر کی ہوئی مسجد کے لیے سفر کرتے ہیں، اسی طرح اپنی قربانی کے جانوروں کو بھی ان کی قربان گاہ پر لے جاتے ہیں۔ ان باتوں کا مقصد ہمارے دل میں یہ اعتقاد راسخ کرنا ہے کہ ہماری حیثیت خدا کے غلاموں اور چاکروں کی ہے جو لبیک کہتے ہوئے آقا کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں، اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنی بندگی کے اقرار کے لیے اپنی قربانیاں اس کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ ۱۲۔ نماز اور قربانی عبادت کے تمام طریقوں میں سب سے زیادہ قدیم، اور فطرت انسانی میں سب سے زیادہ اترے ہوئے ہیں۔

سجدہ، رکوع اور نذر، اظہار بندگی کے وہ مقبول عام طریقے ہیں جو ہر قوم و ملت میں، عام اس سے کہ وہ ایک خدا کی پرستار رہی ہو یا متعدد دیوتاؤں کی، اس نے کسی روح یا بت کو پوجا ہو یا کسی انسان کو معبود بنایا ہو، عام رہے ہیں۔ نماز اور قربانی کی مقبول و محبوب عبادت کسی نہ کسی شکل میں، خواہ وہ کتنی ہی مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی ہو، ہر جماعت میں پائی گئی ہے۔ باقی عبادات کے بارے میں تم کو یہ اتفاق رائے نظر نہیں آئے گا۔

اسوۂ حسنہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریریں

عبدالقدیر سلیم

ابلاغ کا اہتمام

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ کھڑے ہو کر خطاب فرماتے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے آپؐ کے ساتھ دو ہزار سے زیادہ نمازیں پڑھی ہیں --- کہتے ہیں کہ آپؐ بیٹھ کر خطبہ نہیں دیتے تھے۔ ۱ متعدد صحابہ کی روایت سے پتا چلتا ہے کہ آپؐ دو خطبے دیتے تھے' اور ان کے وقفے کے درمیان منبر پر بیٹھ جاتے تھے۔ ۲ لیکن یہ دستور غالباً جمعہ کے خطبات کا تھا' جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے پتا چلتا ہے کہ آپؐ منبر پر رونق افروز ہوتے تو بیٹھ جاتے' یہاں تک کہ موذن اذان سے فارغ ہو جاتا۔ پھر آپؐ کھڑے ہوتے اور خطاب فرماتے۔ اس کے بعد بیٹھ جاتے' اور بات چیت نہ کرتے' پھر کھڑے ہوتے اور خطاب فرماتے۔ ۳ یہی معمول ساری دنیا میں خطبۂ جمعہ کے لیے آج بھی جاری ہے۔

ابن جریر طبری کی روایت کے مطابق مسجدِ نبویؐ میں لکڑی کا منبر سب سے پہلے ۸ ھ میں بنایا گیا۔ اس کے دو زینے اور پھر نشست گاہ تھی۔ ۴

اگرچہ معمول کھڑے ہو کر خطاب کرنے کا تھا' تاہم بعض غیر معمولی حالات میں' اور بڑے مجمعوں میں آپؐ سواری پر بیٹھ کر بھی خطاب فرماتے تھے۔ حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ کے دوران آپؐ اپنی اونٹنی قصواء پر سوار تھے۔ ۵ اسی طرح ہلال بن عامرؓ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ منیٰ میں آپؐ نے اپنے خچر پر سوار ہو کر خطبہ دیا۔ اس وقت آپؐ سرخ دھاری والی چادر اوڑھے ہوئے تھے' حضرت علیؓ آپؐ کے سامنے تھے' اور آپؐ کے

الفاظ کو دہراتے جاتے تھے۔ ۶۔ اس روایت سے' نیز دوسری روایات سے پتا چلتا ہے کہ حجتہ الوداع کے بڑے مجموں میں آپؐ کی آواز تمام حاضرین تک پہنچانے کے لیے مکبرین تھے' جو آپؐ کے الفاظ دہراتے جاتے تھے۔

اگرچہ آپؐ کی آواز بلند اور مخرج نہایت صاف تھا' تاہم آپؐ یہ پسند فرماتے تھے کہ خطاب کے وقت لوگ خطیب کے قریب ہو جائیں۔ بقول سمرہ بن جندبؓ آپؐ نے فرمایا تھا کہ "ذکر (خطبہ) کے وقت حاضر رہو' اور امام کے قریب ہو جاؤ' کیوں کہ وہ شخص جو ہمیشہ دور رہتا ہے' اگر جنت میں داخل بھی ہو' تو تاخیر سے داخل ہو گا۔" ۷۔

چوں کہ کلام اور خطاب سے مقصود کوئی اظہارِ اعجاز نہیں تھا' بلکہ سامعین کی اصلاح اور تعلیم مقصود تھی' اس لیے آپؐ اس طرح کلام فرماتے کہ لوگ بات کو اچھی طرح سنیں' ذہن نشین کر لیں' اور یاد رکھیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو تم لوگوں کی طرح لگاتار اور جلدی جلدی نہیں ہوتی تھی' بلکہ صاف صاف ہر مضمون دوسرے سے ممتاز ہوتا تھا کہ پاس بیٹھنے والے اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے تھے۔ ۸

حضرت حسینؓ نے جب ہند بن ہالہؓ سے آپؐ کی گفتگو کی کیفیت پوچھی' تو انھوں نے کہا کہ آپؐ زیادہ تر غمگین اور ہمیشہ سوچ میں رہتے تھے۔ عموماً خاموش رہتے' بلا ضرورت گفتگو نہ فرماتے۔ کلام کی ابتدا اور انتہا پوری ادائگی کے ساتھ ہوتی تھی۔ ۹۔ بعض لوگ تکبر سے اس طرح گفتگو کرنے کے عادی ہوتے ہیں کہ آدھی بات منہ سے نکلتی ہے' اور آدھی بات منہ ہی میں رہ جاتی ہے۔ آپؐ کی عادتِ شریفہ اس طرح کی نہ تھی۔ جن باتوں پر زور دینا ہوتا' انھیں دو یا تین دفعہ دہراتے کہ لوگوں کے ذہن نشین ہو جائیں' یا تاکید کا اندازہ کر لیں۔ ۱۰۔ بعض دفعہ خطاب فرماتے وقت آنکھیں سرخ ہو جاتیں' آواز بلند ہو جاتی' اور گویائی کی کیفیت کچھ یوں ہوتی' گویا آپؐ غضب ناک ہوں۔ "یوں محسوس ہوتا جیسے آپؐ کسی لشکر سے ڈرانے والے ہوں' (وہ خبردار کرنے والا) جو کہہ رہا ہو کہ تم پر صبح یا شام کو حملہ ہونے والا ہے۔" ۱۱۔

گفتگو میں چہرے' آواز اور ہاتھ کے اشاروں سے کام لیتے۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں ایک ایسے زمانے میں بھیجا گیا ہوں' جب قیامت ان کی طرح قریب ہے" اور یہ کہہ کر آپؐ نے انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی باہم ملائیں۔ ۱۲۔

کلام کی جامعیت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ: بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْکَلِمِ' یعنی میں کلمات جامعات کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔ مختصر اور چھوٹے سے فقرے میں معانی کا ایک سمندر سمو دینا آپؐ کی خصوصیت تھی اسی لیے آپؐ کی تقریر عموماً مختصر ہوتی تھی (اگرچہ بعض طویل خطاب کی روایات بھی ملتی ہیں' جن کا تذکرہ آگے آئے گا)۔ عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ ایک روز ایک شخص تقریر کرنے کھڑا ہوا' اور بڑی لمبی چوڑی باتیں کرنے لگا۔ عمروؓ نے لوگوں سے کہا' "اگر یہ شخص گفتگو میں میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ "میں نے یہ سمجھ لیا ہے" یا "مجھے یہ حکم دیا گیا ہے" اس میں راوی کو شک ہے کہ آپؐ کے الفاظ کیا تھے "کہ گفتگو میں اختصار سے کام لوں' کیونکہ اختصار ہی بہتر ہوتا ہے" -۱۳۔ اسی طرح عمارؓ بتاتے ہیں کہ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ "آدمی کا لمبی نماز پڑھنا اور خطبہ کا اختصار اس کی دانائی کی علامت ہے۔ سو نماز کو طول دو' اور خطبے کو مختصر کرو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض بیان ہی سحر انگیز ہوتا ہے (اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا)" ۱۴۔ اسی طرح جابرؓ کی روایت سے پتا چلتا ہے کہ آپؐ کا خطبہ اوسط طوالت کا ہوتا تھا' نہ بہت زیادہ مختصر' اور نہ بہت طویل -۱۵۔

عید کے خطبے

تاریخ و آثار میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عید کے دن خطبہ دینے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ابوسعید خدریؓ کے مطابق عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی صبح جب مسلمان عیدگاہ میں جمع ہو جاتے' تو پہلے آپؐ عید کی دو رکعت نماز پڑھاتے' پھر کھڑے ہو جاتے' لوگ بیٹھے رہتے' اور آپؐ ان سے خطاب فرماتے' نصیحت کرتے اور ضروری احکام صادر فرماتے' اگر کہیں کوئی لشکر بھیجنا ہوتا تو اس کا انتظام فرماتے' یا کسی اور چیز کا حکم دینا ہوتا' تو اس کا حکم دیتے۔ گویا یہ خطبۂ عید کے موضوعات تھے ۱۶۔ حضرت جابرؓ نے ایک عید کے احوال یوں بیان کیے ہیں کہ ایک عید کے دن وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نمازِ عید کے لیے گئے' تو آپؐ نے پہلے نماز پڑھی (اور سب نے آپؐ کے ساتھ نماز ادا کی)۔ اس نماز میں اذان اور اقامت نہیں کہی گئی۔ جب آپؐ نماز پڑھا چکے' تو حضرت بلالؓ کے سہارے کھڑے ہوئے۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی' لوگوں کو نصیحت فرمائی' انھیں احکامِ الٰہی یاد دلائے' اور اپنی اطاعت پر ابھارا۔ پھر آپؐ عورتوں کی طرف تشریف لے گئے

(جو عید گاہ میں نماز کے لیے علیحدہ صف بند تھیں)۔ بلالؓ ساتھ تھے۔ آپؐ نے انھیں اللہ سے ڈرتے رہنے کا حکم دیا' انھیں نصیحتیں کیں' اور ان کے فرائض یاد دلائے۔ ۱۷۔ مسلم کی ایک اور روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپؐ یہ بھی فرماتے "صدقہ دو' صدقہ دو" اور صدقہ دینے والی اکثر عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ ۱۸۔ عید کے دن خاص طور پر انفاق اور صدقہ دینے کی تاکید غالباً اس لیے کی جاتی تھی کہ آپؐ چاہتے تھے کہ خوشی کے اس دن سب لوگ اچھی طرح کھا پی لیں' اور کوئی غریب اور محتاج محروم نہ رہ جائے۔

عید کے علاوہ بھی بعض دفعہ آپؐ عورتوں کی مجالس میں علیحدہ خطاب فرماتے۔ ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی' اور کہا کہ یا رسول اللہؐ! مردوں نے تو آپؐ کی باتوں سے فائدہ اٹھا لیا' آپؐ اپنی طرف سے ہمارے لیے بھی کوئی دن مقرر فرمادیں' جس میں ہم آپؐ کے پاس آئیں' اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپؐ کو سکھایا ہے' اس میں سے آپؐ ہمیں بھی کچھ سکھائیں۔ آپؐ نے فرمایا' اچھا تم فلاں دن فلاں جگہ جمع ہو جانا۔ وہ جمع ہو گئیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے' اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جو تعلیم دی تھی' اس میں سے آپؐ نے انھیں بھی سکھایا۔ ۱۹۔

پراثر خطابت

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں وہ تاثیر رکھی تھی کہ اصحاب سنتے اور بے اختیار عمل کی طرف دوڑ پڑتے۔ ابن عباسؓ کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ایک دفعہ عید کی نماز کے بعد آپؐ نے پہلے تو مردوں کے سامنے تقریر فرمائی' اور پھر بلالؓ کو ساتھ لے کر عورتوں کے مجمع کی طرف تشریف لے گئے۔ وہاں انھیں نصیحتیں فرمائیں' اور صدقہ و زکوٰۃ کی تلقین کی۔ عورتیں اپنے روپے پیسے سے زیادہ اپنے زیورات سے محبت رکھتی ہیں' کیونکہ وہ نہ صرف ان کا اثاثہ ہوتے ہیں' بلکہ ان کی اشیائے زینت بھی' اور یہ تو خاص عید کا دن تھا ---- "یوم الزینت"۔ لیکن آپؐ کی تلقین کا یہ اثر ہوا کہ عورتوں نے اپنے گلے اور کانوں سے زیور اتار اتار کر بلالؓ کے حوالے کرنے شروع کر دیے۔ ۲۰۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جو حکم ملتا' اس کی فوری اطاعت صحابہ کرام کا شیوہ تھا۔ مگر اس سے آپؐ کے کلام کی تاثیر کا بھی اندازہ ہوتا ہے' حضرت جابرؓ ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ جمعہ کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر اچھی طرح بیٹھ گئے' تو آپؐ نے لوگوں سے بھی فرمایا: "بیٹھ جاؤ!" ابن مسعودؓ مسجد میں داخل ہو رہے تھے' انھوں

نے یہ الفاظ سنے تو مسجد کے دروازے ہی پر بیٹھ گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انھیں دیکھا تو فرمایا: "اے عبداللہ بن مسعود' اندر آ جاؤ"۔۲۱۔

ایسی تو بہت سی روایتیں ہیں کہ آپؐ کی تقریر سن کر لوگ شدتِ تاثیر سے رونے لگتے تھے۔ عرباض بن ساریہؓ کہتے تھے' کہ ایک دفعہ آپؐ (غالباً نماز کے بعد) ہماری طرف منہ کر کے بیٹھ گئے' اور ہمیں نہایت موثر انداز میں نصیحت کی کہ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔۲۲۔

اسی طرح کی ایک روایت اسماء بنت ابی بکرؓ کی ہے۔ ایک دن جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کی آزمائش کا ذکر کیا' تو سامعین آواز سے رونے لگے۔ یہ آواز اور شورِ گریہ اتنا بلند ہوا کہ "...... میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سمجھنے سے قاصر رہی"۔ جب لوگوں کا شور کچھ کم ہوا تو میں نے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا "خدا تمہیں برکت دے' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر کیا فرمایا تھا؟"

انھوں نے کہا' "آپؐ نے فرمایا تھا کہ تم قبروں میں آزمائے جاؤ گے' اور یہ امتحان' فتنۂ دجال کے قریب قریب ہو گا"۔۲۳۔

متعدد روایات سے اس قسم کے زبردست ایمانی اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ عام عرب' اور خصوصاً بدو' نرم دل لوگ نہ تھے۔ ان کے عادات و اطوار میں ایک طرح کی شدت اور سختی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی اشاعت اور دین کے غلبے کے لیے ان کی اس خصوصیت سے پورا پورا کام لیا۔ لیکن پہلے اس سخت دھات کو پگھلانے اور اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی بھی ضرورت تھی۔ آپؐ کے پسندیدہ طور طریقوں' نرم خو اور عفو و درگزر کے نمونے سے صحابہؓ پر نہایت خوش گوار اثرات مرتب ہوئے (نگاہ یار من در من اثر کرد)۔ پھر آپؐ کے موثر اور دل نشین کلام نے بھی قلوب کو نرم کر دیا۔

اسی طرح کے ایک واقعے کے راوی ابوامامہؓ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حاضر تھے۔ آپؐ نے ہمیں نصیحتیں کیں' اور ہمارے دل گداز ہو گئے۔ سعد بن ابی وقاصؓ رو پڑے اور بہت روئے۔ کہنے لگے' کاش مجھ کو موت آ جاتی' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم جنت کے لیے پیدا کیے گئے ہو' تو تمہاری عمر جتنی طویل اور عمل کی نیکی جتنی زیادہ ہو گی تمہارے لیے بہتر ہی ہو گا۔۲۴۔

شاہکار خطاب

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سادہ لیکن پراثر خطابت کے کئی ایسے نمونے تاریخ میں

محفوظ ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے اپنی خدا داد صلاحیت اور دانائی سے کام لے کر اسلامی تحریک کو اپنے ابتدائی دور ہی میں جاہلیت کی چٹانوں پر پاش پاش ہونے سے کس طرح بچایا۔ مدینہ کے دو طاقت ور قبائل اوس اور خزرج تھے۔ ظہورِ اسلام سے قبل ان میں شدید رقابت تھی، جس کے نتیجے میں ایک بڑی جنگ (بعاث) بھی ہو چکی تھی۔ یہ رقابت بعد میں بھی کبھی کبھی عود کر آتی تھی۔ ایک دفعہ دو صحابی جو ان مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے، اس جنگ پر گفتگو کرنے لگے۔ واقعات کے بیان میں پہلے تو تلخی آئی، پھر نوبت سخت کلامی تک پہنچی، اور آخر کار دونوں نے اپنے اپنے قبیلے کو آواز لگائی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا، تو وہاں تشریف لے گئے اور خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اے گروہِ مسلمین! اللہ اللہ یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ حالانکہ میں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں۔ اللہ نے تمہیں اسلام کا راستہ دکھا دیا ہے، اور اس کے ذریعے تمہیں عزت و شرف بخشا ہے، اسی کے ذریعے جاہلیت کی باتوں سے تمہارا رشتہ کاٹ دیا ہے، اسی کے ذریعے تمہیں کفر سے نجات دلائی ہے، اور تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے الفت پیدا کر دی ہے... -۲۵-

لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور وہ رونے لگے۔ دونوں گروہوں سے تعلق رکھنے والوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، اور آپؐ کے ساتھ واپس ہوئے۔-۲۶-

اس طرح کی نازک صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے آپؐ نے جو خطبات ارشاد فرمائے، اور ان میں سے جو خطبات تاریخ کے صفحات میں محفوظ رہ گئے ہیں، ان کا ایک شاہکار وہ خطاب ہے، جو ہوازن کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں ارشاد فرمایا تھا۔ یہ خطبہ بہت طویل نہیں، لیکن دنیا میں شاید ہی کسی قائد کی مثال پیش کی جا سکتی ہو، جس نے مختصر الفاظ میں اپنے رنجور، غضب ناک اور دل برداشتہ ساتھیوں کے دل اعتماد اور گرم جوشی سے اسی طرح معمور کر دیے ہوں۔

واقعہ یہ تھا کہ فتح مکہ کے بعد ہی ہوازن کا معرکہ پیش آیا۔ اس میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا، اس کا بڑا حصہ آپؐ نے قریشِ مکہ (جو ابھی ابھی اسلام کے دائرۂ اطاعت میں آئے تھے) اور دوسرے قبائل میں تقسیم فرما دیا۔ مدینہ کے انصار کو یہ بات بری لگی۔ ان میں سے بہت سے لوگ فضول باتیں کرنے لگے۔ بعض نے یہ بھی کہہ دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم (یعنی قریشِ مکہ) کی طرف داری کی ہے۔ سعد بن عبادہؓ ایک جلیل القدر انصاری اور صحابیِ رسولؐ تھے۔ وہ مدینہ کے ان غیر مطمئن عناصر کی نمائندگی کرتے ہوئے آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ

نے ان سے دریافت فرمایا کہ تمہارا موقف کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ' میں تو اپنی قوم کے ساتھ ہوں۔ یعنی وہ بھی مدینہ کے ان نوجوانوں کے ہم خیال تھے کہ جو اس تقسیم کو اپنی حق تلفی اور اپنے ساتھ بے انصافی پر محمول کر رہے تھے۔

آپؐ کے حکم پر انصار ایک جگہ جمع ہوئے' اور آپؐ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"...... اے گروہِ انصار! ک ی بات ہے' جو مجھے تمہاری طرف سے معلوم ہوئی ہے؟ کیا تم اپنے دلوں میں میرے خلاف غصہ پاتے ہو؟

"کیا تم گمراہ نہیں تھے' تو جب میں آیا' تو اللہ نے تمہیں ہدایت دی۔ اور تم مفلس تھے تو اللہ نے تمہیں غنی کر دیا' اور تم باہم دشمن تھے' تو اللہ نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے الفت ڈال دی"۔

لوگوں نے کہا "ہاں بے شک' اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کی نعمت و احسان اور فضل سب سے بڑھ کر ہیں"۔

پھر آپؐ نے فرمایا:

"اے گروہ انصار' تم مجھے جواب کیوں نہیں دیتے"؟

شاید لوگوں کی آواز پست اور لہجہ دھیما تھا۔ آپؐ کے مکرر جواب طلب کرنے پر لوگوں نے کچھ بلند آواز سے کہا "یارسول اللہؐ ہم آپؐ کو کیا جواب دیں؟ اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کی نعمت و احسان اور فضل سب سے بڑھ کر ہیں"۔

آپؐ نے فرمایا:

"نہیں' بلکہ خدا کی قسم' تم چاہتے تو یہ بھی کہہ سکتے تھے ---- اور اس صورت میں بھی تم سچ ہی کہتے' اور تمہاری تصدیق ہی کی جاتی ---- کہ تم [حضور اکرمؐ] ہمارے پاس جھٹلائے ہوئے آئے تھے' تو ہم نے تمہاری تصدیق کی۔ تمہیں لوگوں نے چھوڑ دیا تھا' تو ہم نے تمہاری مدد کی۔ تم دھتکارے ہوئے تھے تو ہم نے تمہیں پناہ دی' اور تم محتاج تھے' تو ہم نے تمہاری اعانت کر کے اپنے برابر کر لیا۔

"اے گروہِ انصار' تم اپنے دل میں ایک ایسے ناپائیدار مال کی بنیاد پر ناراض ہو گئے ہو' جو میں نے ابھی تازہ اسلام لانے والی قوم کو تالیفِ قلب کے لیے دیا ہے' حالانکہ میں نے تمہیں تمہارے اسلام کے سپرد کیا ہے۔

"اے گروہِ انصار' کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے جائیں' اور تم

اپنے گھروں میں رسول اللہؐ کو لے جاؤ؟ خدا کی قسم، جسے لے کر جاتے ہو، وہ اس سے بہتر ہے، جو وہ لے کر جا رہے ہیں۔ پس قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اگر ہجرت مقدر نہ ہوتی، تو میں انصار میں سے ایک شخص ہوتا۔ اگر تمام لوگ ایک گھاٹی کی طرف جائیں، تو میں انصار والی گھاٹی کی طرف جاؤں گا۔

"اے اللہ، انصار پر رحم فرما، انصار کے بیٹوں پر رحم فرما، اور انصار کے بیٹوں کے بیٹوں پر رحم فرما"۔

راوی کہتے ہیں کہ آپؐ کی گفتگو سن کر سارے لوگ رونے لگے، یہاں تک کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں، اور سب نے کہا:

"اپنی قسمت اور حصے میں ہم رسول اللہؐ کے فیصلے پر راضی ہیں"۔۲۷

معانی کی دنیا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام پر گفتگو کو ہم جاحظ کے اس نہایت جامع تبصرے کے ساتھ ختم کرتے ہیں، جسے علامہ رافعی نے "اعجاز القرآن" میں نقل کیا ہے، بقول جاحظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایسا ہوتا تھا کہ "اس میں الفاظ تو کم ہوتے مگر معانی کی ایک دنیا آباد ہوتی۔ بناوٹ سے خالی اور تکلف سے پاک . . . جہاں بسیط و تفصیل کی ضرورت ہوتی، وہاں آپؐ کا کلام مبسوط اور مفصل ہوتا، اور جہاں ایجاز و اختصار کی ضرورت ہوتی، وہاں مختصر۔ نامانوس اور اجنبی الفاظ سے آپؐ گریز فرماتے۔ سوقیانہ اور شائستگی سے گرے ہوئے کلام سے آپؐ اجتناب فرماتے۔ جب بھی آپؐ کی زبان گویا ہوتی، اس سے حکمت کے جواہر ہی نکلتے! اور جب بھی آپؐ کلام فرماتے (وہ تائید الٰہی اور توفیق خداوندی کی بنا پر خطا و لغزش سے) معصوم ہوتا، اور اس میں نہایت پاکیزگی اور شائستگی ہوتی۔

"پس یہی آپؐ کا وہ کلام تھا، جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں آپؐ کی محبت ڈال دی تھی، اور قبولیت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ آپؐ کی ہیبت اور محبت دونوں کو بیک وقت لوگوں کے دلوں میں اکٹھا کر دیا گیا، اور آپؐ کے کلام کو حسنِ تفہیم اور قلتِ الفاظ کا جامع بنا دیا گیا۔ آپؐ باوجودے کہ کلام کا اعادہ فرمانے سے مستغنی تھے، اور سامع کو بہت کم ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ آپؐ اپنی بات کا اعادہ فرمائیں، پھر بھی جب آپؐ گفتگو فرماتے تو نہ کوئی کلمہ ساقط ہوتا، نہ (مکرر ارشاد فرمانے میں) بھٹکتے، اور نہ کوئی دلیل آپؐ سے چھوٹ جاتی۔ پھر آپؐ کے کلام کے سامنے نہ تو کسی نے زبان کھولنے کی جرات کی، اور نہ کوئی خطیب آپؐ پر فوقیت حاصل

کر سکا۔ آپؐ کے انتہائی کامیاب خطبے' قلیل ترین الفاظ پر مشتمل ہیں۔ فریق مقابل کے آگے مسکت دلائل پیش کرنے میں آپؐ انھی باتوں سے کام لیتے' جن کو وہ پہلے سے جانتا ہوتا۔ صرف صداقت کو اپنی دلیل بناتے' اور صرف حق کی بنا پر کامیابی حاصل کرنا چاہتے۔ اس باب میں نہ چکنی چپڑی باتوں اور فریب سے فائدہ اٹھاتے' نہ عیب چینی کرتے۔ نہ ست روی اختیار فرماتے' اور نہ جلد بازی کرتے۔ نہ بات کو بڑھاتے اور نہ گھٹاتے۔

"پھر یہ کہ لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے زیادہ عام نفع بخش کلام نہیں سنا۔ لفظاً' نہ آپؐ کے کلام سے زیادہ سچا اور عدل و توازن کے اعتبار سے متوازن تر کلام کبھی لوگوں کے کان میں پڑا' اور نہ روش کے لحاظ سے اس قدر حسین اور اپنے مطالب کے لحاظ سے اتنا مکرم کلام کسی کے سننے میں آیا۔ نہ موقع کے لحاظ سے اتنا برمحل' نہ مخرج میں اتنا نرم۔ نہ معنی کے لحاظ سے اتنے فصیح اور نحوی کے لحاظ سے اتنے واضح کلام سے لوگوں کے کان کبھی آشنا ہوئے تھے"۔۲۸۔

محفوظ رکھنے کا اہتمام

. حدیث' سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں آپؐ کے جو خطبات (یا ان کے اقتباسات) اور فرامین محفوظ رہ گئے ہیں' وہ آپؐ کی معجز بیانی' حکمت و دانائی' الہامی فراست اور زندہ معجزے کی جھلکیاں ہیں' بلکہ ہمیشہ کے لیے ہدایت و راہ نمائی کے روشن منار ہیں۔ یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ آپؐ کے تمام خطبات' بہ تمام و کمال محفوظ نہیں رہے ہیں۔ اکثر کتابوں میں جستہ جستہ اقتباسات ہی ہیں۔ اکثر خطبات کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ اصل خطبہ بڑا تھا اور یہ اس کا ایک حصہ ہی ہے۔ ایک چینی کہاوت کے مطابق ہلکی روشنی بھی قوی ترین حافظے سے زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔ چوں کہ بیش تر صحابہ نے آپؐ کے ان طویل خطبات کو محفوظ رکھنے کا کما حقہٗ اہتمام نہیں کیا تھا' (وجوہ سے بحث نہیں) اور آپؐ کے حینِ حیات انھیں ضبطِ تحریر میں نہیں لائے' اس لیے وہ اپنی مکمل صورت میں موجود نہیں ہیں۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں:

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے کھڑے ہوئے' اور اسی جگہ آپؐ نے قیامت تک ہونے والی ساری باتوں کا ذکر فرمایا۔ جن لوگوں نے ان باتوں کو یاد رکھا' یاد رکھا' اور جو بھول گئے' بھول گئے۔ یہ میرے دوست (یعنی حضرت حذیفہؓ کے ساتھی صحابہ) اسے جانتے ہیں' جب کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی ہے' جسے میں بھول گیا تھا' تو مجھے وہ بات اپنے وقوع کے وقت یاد آ جاتی ہے جسے آپؐ نے بیان فرما دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک آدمی ایک غائب شخص کے

چہرے کو یاد رکھتا ہے' اور جب اسے دیکھ لیتا ہے' تو پہچان جاتا ہے"۔۲۹۔

ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے بھی غالباً اسی خطبے یا اس طرح کے کسی دوسرے خطاب کی طرف اشارہ کر کے اس کے موضوعِ گفتگو پر بھی کچھ روشنی ڈالی۔ وہ کہتے تھے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر اسی جگہ آغازِ پیدائش سے اہلِ جنت کے اپنے مقامات میں' اور اہلِ دوزخ کے اپنے مقامات میں داخل ہو جانے تک کا ذکر کیا۔ جس نے اسے یاد رکھا' اس نے یاد رکھا' اور جو بھول گیا' سو بھول گیا"۔۔۳۰

ایسی ہی روایت حضرت عمرو بن اخطب انصاریؓ کی ہے' جس سے خطبے کے طول کا اندازہ ہوتا ہے' اگرچہ دوسری روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کے خطبات عموماً مختصر ہوتے تھے' تاہم ایسے طویل خطبات بھی آپؐ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ عمرو بن اخطبؓ کہتے ہیں:

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہمیں صبح کی نماز پڑھائی' پھر منبر پر چڑھے اور ہم سے خطاب فرمایا' یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ آپؐ اترے' اور ظہر کی نماز پڑھائی۔ پھر منبر پر تشریف لے گئے' اور ہم سے خطاب فرمایا' یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ آپؐ نیچے تشریف لائے اور نماز پڑھائی' پھر منبر پر تشریف لے گئے' یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ آپؐ نے ہمیں ان تمام باتوں کی خبر دی' جو قیامت تک ہونے والی تھیں۔ ہم میں سے وہ شخص عقل مند تر ہے' جس نے ان باتوں کو زیادہ یاد رکھا"۔۔۳۱۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ پورا خطبہ کسی نے یاد نہ رکھا' یا کم از کم اس کی مکمل روایت نہیں کی گئی۔ احادیث و آثار میں "کتاب الفتن" تاریخ اور پیش گوئیوں کے طور پر جو روایات ملتی ہیں' خیال ہے کہ اس طرح کے خطبات سے ماخوذ ہوں گی۔ اس طرح کے طویل خطبات اپنے موضوع کی وسعت اور تنوع کی بنا پر یقیناً اور بہت سی احادیث کا بھی جزو بن گئے ہوں گے' اور اس طرح احادیث و آثار کی کتابوں میں آپؐ کے جو ارشادات محفوظ ہیں' ان میں سے بہت سے ایسے ہی خطبات کے اجزا ہوں گے۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ خطبات بھی جوں کے توں محفوظ رہ جاتے یا شاید یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جس چیز کو چاہتا ہے' محو فرما دیتا ہے' اور جسے چاہتا ہے' باقی رکھتا ہے۔ اس کی حکمت ہر چیز پر محیط ہے۔

حواشی

۱۔ ولی الدین محمد بن عبداللہ عمری: مشکوٰۃ المصابیح: محمد سعید اینڈ سنز، کراچی، ج ۱، ۱۳۳۱

۲۔ ایضاً، ج ۱، ۱۳۳۱، ۱۳۲۹، ۱۳۳۱

۳۔ ایضاً، ج ۱، ۱۳۲۹

۴۔ طبری، محمد ابن جریر، تاریخ الامم والملوک (اردو ترجمہ) ج ۱، ص ۳۶۷

۵۔ شبلی، حوالہ مذکور، ج ۲، ص ۱۵۴، مشکوٰۃ ج ۱، نمبر ۲۴۸۱

۶۔ ابوداؤد، بحوالہ مشکوٰۃ ا ج ۲، ۳۱۶۶

۷۔ ایضاً، ج ۱، ۱۳۰۸۔

۸۔ کتاب الشمائل ترمذی: نور محمد، کراچی، ص ۱۶۵، نیز عیاض، الشفاء، ص ۷۰

۹۔ کتاب الشمائل، ص ۶۷ - ۱۶۹، اعجاز القرآن، ص ۲۳ - ۳۲۲

۱۰۔ آپؐ کے "ہربات کو تین دفعہ دہرانے" کا مطلب یہ نہیں کہ ہر موقعہ پر ہر جملے کو تین تین دفعہ دہراتے تھے۔ اس طرح کی گفتگو نہ صرف سنجیدہ طریقِ تکلم کے خلاف ہے، بلکہ آدابِ فصاحت و خطابت سے بھی بعید ہے۔ مختلف روایتوں میں کلام اور خطبات جس طرح روایت ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ جس بات کی تاکید فرمانا چاہتے، اس کی تکرار فرماتے، تاکہ سامعین کے ذہن میں اس کی اہمیت جاگزیں ہو جائے۔ بعض دفعہ آپؐ کے گرد سامعین کا مجمع ہوتا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ سامنے، داہنے اور بائیں، تینوں اطراف میں موجود اصحاب کی طرف توجہ فرما کر آپؐ بات کو دہراتے ہوں۔ (محمد بن عیسیٰ ترمذی: شمائل ترمذی، (ترجمہ مولانا محمد زکریا) دارالاشاعت، کراچی، ص ۸ - ۱۵۷۔)

۱۱۔ مسلم، الجامع الصحیح، بحوالہ مشکوٰۃ: ج ۱ نمبر ۱۳۲۳

۱۲۔ مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ: ج ۳، ۵۶۸۲

۱۳۔ ابوداؤد، بحوالہ مشکوٰۃ، ج ۲، ۳۵۹۴

۱۴۔ مسلم، بحوالہ مذکور، ج ۱، ۱۳۲۲

۱۵۔ ایضاً، ج ۱، ۱۳۲۱

۱۶۔ بخاری و مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ: ج ۱، ۱۳۴۲ ۔

۱۷۔ نسائی، بحوالہ مشکوٰۃ: ج ۱، ۱۳۲۶

۱۸۔ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ' ج ۱' ۱۳۶۸

۱۹۔ بخاری بحوالہ مشکوٰۃ ج ۱' ۱۲۶۱

۲۰۔ بخاری و مسلم' بحوالہ مشکوٰۃ: ج ۱' ۱۳۴۵

۲۱۔ ابوداؤد' بحوالہ مذکور' ج ۱' ۱۳۳۴

۲۲۔ احمد' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ' بحوالہ مذکور: ج ۱' ۵۷

۲۳۔ ایضاً' ج ۱' ۱۳۹

۲۴۔ احمد' بحوالہ مذکورہ ج ۲' ۱۵۲۶

۲۵۔ ابن ہشام' السیرۃ النبویہ: ج ۲' ص ۲۰۵

۲۶۔ ایضاً ج ۲' ص ۲۰۵

۲۷۔ ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ: ج ۴' ص ۴۳ – ۱۳۱' : بخاری: ج ۲' ص ۳۸۲

۲۸۔ رافعی' مصطفیٰ صادق: اعجاز القرآن و بلاغۃ النبویۃ مطبع الاستقامۃ مصر' ۱۹۴۵' ص ۱۵ – ۳۱۴' ۳۱۴

۲۹۔ بخاری و مسلم' بحوالہ مشکوٰۃ: ج ۳' ۵۱۱۴

۳۰۔ بخاری' بحوالہ مذکور' ج ۳' ۵۱۱۴

۳۱۔ مسلم' بحوالہ مشکوٰۃ' ج ۳' ۵۷۸۲۔ آپؐ کے خطبات کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سیرت کے علاوہ "جمہرۃ الخطب العربیہ" میں عرب کے مشہور خطبا کے ساتھ آپؐ کی تقاریر بھی ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی نے "الوثائق السیاسیۃ" میں آپؐ کی تحریریں جمع کی ہیں۔ راقم الحروف نے بھی پورے پس منظر کے ساتھ آپؐ کی تقریریں اور تحریریں جمع کی ہیں۔

آپ کے مطالعے کے لیے
چند منتخب کتابیں

اسلام کا فوجداری قانون	(مکمل تین حصے)	تالیف: عبدالقادر عودہ شہید/ ترجمہ: ساجد الرحمٰن صدیقی	روپے ۳۶۰/-
اسلام کا نظامِ حکومت	(الاحکام السلطانیہ)	امام ابوالحسن الماوردی/ ترجمہ، ساجد الرحمٰن صدیقی	۹۰/-
تاریخ افکار و علومِ اسلامی	(مکمل دو حصے)	علامہ راغب الطباخ / ترجمہ: افتخار احمد بلخی	۱۰۸/-
تحریک آزادئ ہند اور مسلمان	(مکمل دو حصے)	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۱۲۳/-
مولانا مودودی کی تقاریر	(حصہ اول۔ دوم)	مرتبہ: ثروت صولت	۸۰/-
اِسلام کا نظریۂ ملکیت	(مکمل دو حصے)	ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی	۸۱/-
زکوٰۃ، فلسفہ اور قانون		فرشتہ۔ ج۔ د۔ سائس	۷۵/-
ادبیاتِ مودودیؒ		تالیف پروفیسر خورشید احمد	۳۲/-
ارمغانِ اقبالؒ	(علامہ اقبالؒ پر نادر مقالات و مضامین)	ڈاکٹر رحیم بخش شاہین	۶۶/-
اوراقِ گم گشتہ		″ ″ ″	۳۰/-
ترکی قدیم و جدید	(رُودادِ سفر)	خلیل احمد حامدی	۲۵/-
ترکستان میں مُسلم مزاحمت		آباد شاہ پوری	۲۱/-
مشرقی ترکستان		ثروت صولت	۲۲/۵۰
ترک اور ترکی		″ ″	۶۰/-
عورت اور دورِ جدید		منیر احمد خلیلی	۳۳/-

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور (پاکستان)

فیکس: ۷۶۵۸۹۷۴ - (۰۴۲)   فون: ۳۲۵۲۴۳ - ۷۶۶۴۵۰۳

تحریک اسلامی

اسلامی تحریکیں، ماضی اور حال

روحِ جہاد کی تجدید

خلیل احمد حامدی

جہاد اور اس کے اثرات

مسلم امت کو جس چیز نے ہمیشہ فعّال اور تیز رَو بنائے رکھا وہ جہاد تھا۔ جہاد کی بدولت مسلمانوں نے دنیا کے اندر سے ظلم و ستم، شرک و کفر اور انسانی خدائی کا قلع قمع کیا اور انسان کو اوہام و خرافات کی زنجیروں سے نجات دی۔ اور پھر جہاد کی بدولت علم و تحقیق کے گلستان پیدا کیے، عدل و انصاف کی بہاریں برپا کیں، انسانوں کو رنگ و نسل اور تفاخر و تکاثر کے پیمانوں سے ناپنے کے بجائے ایمان و تقویٰ کے پیمانوں سے ناپنے کی طرح ڈالی۔ جہاد نے مسلمان نوجوانوں کو تن آسانی کے بجائے جفاکشی، اور عیش کوشی کے بجائے پاک نفسی کے جوہر سے آراستہ کیا۔ ان کو اپنوں کے لیے موم اور دشمنوں کے لیے سنگِ خارا بنا دیا۔ مسلم امت کو پسپائی کے بجائے پیشرفت، سرافگندگی کے بجائے سرفرازی اور سفلہ پیشی اور دون ہمتی کے بجائے علو پسندی اور جگرداری کا درس دیا۔ جہاد کی برق و رعد کے سامنے قیصر بھی مات کھا گیا اور کسریٰ بھی۔ بحرالکاہل سے لے کر بحرِ ظلمات تک اسلام کا سایۂ رحمت پھیل گیا۔ ویانا کی دیواروں تک اس کی گونج پہنچ گئی۔ اندلس کی تاریک دنیا اس کی روشنی سے چمک اٹھی۔ الغرض جب تک مسلم امت کے اندر روحِ جہاد کام کرتی رہی، وہ خوددار و پرشکوہ رہے اور جونہی یہ روح رخصت ہوئی، ان کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ منتشر بھیڑوں کے گلے بن گئے۔ علم و فن تو ان کے ہاں سے رخصت ہوا ہی تھا، وہ آزادی و استقلال بھی کھو بیٹھے اور آج تک ماضی کی غلطیوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔

استعماری طاقتیں مسلمانوں کی قوت کا حقیقی راز سمجھتی تھیں۔ انھوں نے مسلمانوں پر اپنے

تسلط کے منحوس پر پھیلانے کے بعد جہاد کا تصور مسلمان کے دل و دماغ سے کھرچنے کی کوشش کی۔ اور مسلمانوں کے ایک طبقے کو اس بات کا قائل کرنے میں کامیاب ہو گئیں کہ جہاد سے مراد صرف مدافعت ہے اور بہتر ہے کہ اس لفظ کو اسلام کی ڈکشنری سے نکال دیا جائے کہ اس سے خون کی بو آتی ہے۔ اسلامی جہاد کے بارے میں تو ان طاقتوں کا یہ رویہ تھا' مگر جب انھیں اپنے مفادات کی حفاظت کی ضرورت پیش آئی تو پہلی جنگِ عظیم میں بھی اور دوسری عالمگیر جنگ میں بھی وہ مسلمان نوجوانوں کو ایندھن بناتی رہیں۔ الجزائری نوجوان فرانس کے لیے جرمنوں کے خلاف خون کے نذرانے پیش کرتے رہے اور ہندو پاک کے مسلمان انگریزوں کی خاطر عراق و فلسطین میں اور برما و ملایا میں جانیں دیتے رہے۔ اور اب امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر صومالیہ میں اپنے اڈے قائم کرنے کے لیے اور بحر احمر کو اپنی تحویل میں لینے کی خاطر "پاکستانی مجاہدین" کو مظلوم صومالیوں کی سرکوبی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اور اگر یہی "پاکستانی مجاہدین" ستم رسیدہ کشمیریوں کی حمایت میں آواز اٹھائیں تو انھیں "دہشت گرد" کہا جاتا ہے۔

اسلامی تحریکوں کا یہ زبردست کارنامہ ہے کہ انھوں نے صدیوں سے مردہ روحِ جہاد کو دوبارہ ملتِ اسلامی کے اندر زندہ کر دیا ہے۔ اب انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اور ترکی سے لے کر موزمبیق تک جہاد کے نغمے گونج رہے ہیں۔ اور یہی لہر مغرب کو مخبوط الحواس کیے جا رہی ہے۔ مگر جس قدر اس لہر کے خلاف مغرب کے قائدین اور مغرب کے ذرائع ابلاغ پروپیگنڈے کی توپیں کھولے ہوئے ہیں' اسی قدر اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

نظریہ جہاد کو اپنی اصل حقیقت کے ساتھ سب سے پہلے ہندوستان کے ایک ۲۳ سالہ نوجوان نے پیش کیا۔ اس نوجوان کا نام ابو الاعلیٰ مودودی تھا اور وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے نمائندہ اخبار "الجمعیت" دہلی کا مدیر مسئول تھا۔ اس نوجوان نے اخبار کے صفحات پر ۲۲ قسطوں میں اسلام کے قانونِ جنگ پر ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون کو بعد میں جناب علامہ سید سلیمان ندویؒ نے "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے شائع کیا۔ جہاد کے موضوع پر دورِ حاضر کی یہ پہلی کتاب ہے جو ہند کی سرزمین میں منصہ ظہور پر آئی۔ اس کے بعد امام حسن البناؒ نے "جہاد فی سبیل اللہ" کے عنوان سے ایک کتابچہ تحریر کیا۔ یہ وہ دور تھا کہ مسلمانوں کے اہلِ علم و دانش' جہاد کے بارے میں مسلسل صفائیاں اور معذرتیں پیش کر رہے تھے۔

یہ تو فکری میدان میں دعوتِ جہاد کا آغاز تھا۔ ۱۹۴۷ کو جب اقوامِ متحدہ کی طرف سے "اسرائیل" کے قیام کا اعلان ہوا اور فلسطین کا بہت بڑا حصہ "اسرائیل" کو دیا گیا تو اخوان

المسلمون نے یہودیوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا اور ان علاقوں پر جو اسرائیل کے حصے میں آ رہے تھے، قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ گو یہ جہاد چند ماہ تک جاری رہا۔ مگر اخوانی مجاہدین نے شجاعت و شہادت کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ ہو گئی۔ یہ تفصیلات معلوم کرنے کے لیے ملاحظہ ہو استاذ کامل الشریف کی کتاب جو خود بھی جہاد میں شریک رہے: "الاخوان المسلمون فی حرب فلسطین"۔

جہادِ افغانستان کے اثرات

جہادِ فلسطین کے بعد سب سے بڑا اور طویل جہاد افغانستان میں برپا ہوا ہے۔ یہ جہاد براہِ راست دنیا کی دوسری بڑی طاقت سوویت یونین کے ساتھ تھا۔ ۱۳ سال (۱۹۷۹۔ ۱۹۹۲) تک افغانستان کے کوہ و دمن، خونِ شہیداں سے لالہ رنگ رہے۔ یہ جہاد صرف افغانوں تک محدود نہ رہا، بلکہ اس کی لَے اکنافِ عالم تک پہنچی اور دنیا میں ہر اسلامی تحریک نے اس میں حصہ لیا۔ اپنے نوجوان بھی بھیجے، رقوم اور سامان بھی بھیجا۔ خود اپنے اپنے ملک میں جہاد کی فضا پیدا کی۔ جہاد کے موضوع پر اخبارات و رسائل نے بڑے وقیع مضامین شائع کیے۔ فلمیں تیار ہوئیں۔ بیش قیمت کتابیں تحریر کی گئیں۔ عصرِ حاضر میں جہاد کے احکام و آداب کی تشریح کی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ افغانستان میں ٹریننگ کیمپ قائم کیے گئے جن میں نوجوانوں کو حربی تربیت بھی دی جاتی رہی اور روحانی بھی۔ جن نوجوانوں نے ان کیمپوں سے تربیت پائی ہے اور وہ افغانستان میں روسیوں سے لڑتے رہے ہیں، ان کے دلوں میں شوقِ جہاد کی ایسی شمع روشن ہو گئی ہے کہ اب اسے کوئی نہیں بجھا سکتا۔ امریکہ اپنی کسی مصلحت کی خاطر اس وقت جہادی کارروائیوں کو نظرانداز کرتا رہا۔ مگر اب وہی امریکہ مجاہدین کو دہشت گرد قرار دیتا ہے، لیکن بات آگے بڑھ چکی ہے۔

انتفاضہ فلسطین

جہادِ افغانستان کے دوران ہی ۱۹۸۹ میں فلسطین میں انتفاضہ برپا ہو گیا۔ اس کو جنم دینے والی فلسطین کی اسلامی تحریک تھی۔ غزہ کی اسلامی یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ جن کے کان جہادِ افغانستان کی داستانیں سنتے رہتے تھے اور جن کے اساتذہ خود بھی جذبۂ جہاد سے سرشار تھے "اسرائیل" کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسجدوں کو انھوں نے اپنا مرکز بنا لیا اور پتھروں کو ہتھیار۔ انتفاضہ کا آغاز گو چند نوجوانوں سے ہوا، مگر یہ تحریک پوری فلسطینی قوم میں یکایک پھیل گئی۔ اس میں ان فلسطینیوں نے بھی حصہ لیا جو ۱۹۶۷ سے اسرائیل کی غلامی میں آ گئے تھے۔ یعنی غزہ اور مغربی

کنارے کے باشندے۔ اور وہ بھی اس میں داخل ہو گئے جو ۱۹۴۸ سے اسرائیل کی رعایا بنا دیے گئے تھے اور انھیں فلسطینیوں کے بجائے "اسرائیلی" کہا جاتا تھا۔ انتفاضہ نے یہودیوں کے ہوش و حواس گم کر دیے۔ اسرائیلی حکام نے انتفاضہ کو بیخ و بن سے اکھاڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مگر ہر اسرائیلی ضرب اس میں مزید زندگی پیدا کرتی رہی۔ ۴ برسوں کے اندر انتفاضہ میں حصہ لینے والے ایک ہزار نوجوان شہید ہوئے۔ ۲۵ ہزار مفلوج ہوئے اور ۳۰ ہزار مختلف اوقات میں جیلوں میں ڈالے گئے۔ فلسطین کی تمام مساجد جہاد کے اڈے بن گئیں۔ لوگوں میں اسلام کی طرف غیر معمولی رجوع ہو گیا' بلکہ پوری فلسطینی قوم میں باہمی تعاون و اخوت کی غیر معمولی روح ابھر آئی۔ اندرونِ فلسطین کے لوگ یاسر عرفات کو بھول گئے اور ان کا اصل لیڈر احمد یٰسین بن گیا۔ اور یہ علامات واضح ہونے لگیں کہ اسرائیل کے لیے انتفاضہ سے نجات پانا آسان نہیں ہے۔ اسرائیل نے انتفاضہ کے تین سو سے زائد رہنما چن کر انھیں خانہ بدر کر دیا اور وہ لوگ سخت سردی کے زمانے میں لبنان سے متصل علاقے مرج العامر میں پناہ گزین ہو گئے' مگر اس اقدام نے مزید آتشِ جہاد بھڑکا دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ اور یورپی طاقتوں نے مل کر یاسر عرفات اور تنظیم آزادیِ فلسطین کے چند لوگوں کو لے کر خفیہ طور پر ناروے میں مذاکرات شروع کیے جو آخرکار واشنگٹن میں "غزہ و اریحا" کے نام سے فلسطین فروشی کے معاہدے پر منتج ہوئے۔ ان حالات نے جہاد کو اور تیز کر دیا ہے۔ اور اب "حماس" ہی فلسطینی قوم کی امنگوں کا مرکز بن گئی ہے۔

بوسنیا کی جنگ

فروری ۱۹۹۲ سے بوسنیا کی سرزمین بھی جہاد آشنا ہو چکی ہے۔ بوسنیا نے سابقہ یوگوسلاویہ کی دوسری جمہوریتوں کے نقشِ قدم پر اپنی آزادی کا اعلان کیا تو سرب جمہوریہ نے اسے تسلیم نہ کیا' بلکہ معدوم یوگوسلاویہ کی وراثت کی دعویدار بن کر اس نے بوسنیا پر حملہ کر دیا۔ خود بوسنیا کے اندر رہنے والی سرب نسل کی آبادی نے بھی سرب جمہوریہ سے تعاون کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سربوں نے بوسنیا کے ستر فیصد علاقے پر قبضہ کر لیا یا اس پر وحشیانہ حملے کیے۔ بوسنیا کے پاس نہ فوج تھی اور نہ اسلحہ۔ معدوم یوگوسلاویہ کی تمام فوج اور اسلحہ بلغراد (دارالحکومت جمہوریہ سربیا) میں تھا۔ بوسنوی مسلمان یکایک شدید ظلم و ستم کا شکار ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصے کے اندر ایک لاکھ انسان شہید اور اتنے ہی نظربندی کے کیمپوں میں محبوس ہو گئے۔ پچاس ہزار کے قریب بوسنوی عورتوں کی عزت پامال ہو گئی اور ہجرت کرنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی۔ مسلمان حکمران

بے حس بیٹھے رہے۔ بوسنیا کے دفاع کا سارا بوجھ بوسنیا کی نوزائیدہ حکومت اور بوسنیا کے نوجوانوں پر آ پڑا۔ ان پر مزید ستم یہ ہوا کہ اقوامِ متحدہ (جو اس وقت امریکہ کی کنیز بن چکی ہے) کی طرف سے بوسنیا کو اسلحہ کی سپلائی پر پابندی لگا دی گئی۔ بقول سعدی: سنگ ہارا بستند و سگاں را کشادند۔ اس صورتِ حال نے بوسنوی نوجوانوں کے اندر عظیم الشان جذبۂ جہاد پیدا کر دیا۔ ان نوجوانوں کے اندر وہ گروہ خاص طور پر پیش پیش ہے جو عالمِ عرب کی یونیورسٹیوں میں پڑھتا رہا۔ اور وہاں مولانا مودودیؒ، حسن البناؒ اور سید قطبؒ کی دعوت سے متاثر ہوا۔ یہ گروہ اب "مسلم فورسز" کے نام سے بوسنیا آرمی کا ایک حصہ ہے۔ اس کی قیادت خود بوسنیا کے نوجوان کر رہے ہیں۔ (خاکسار خود مسلم فورسز کے کمانڈروں سے زغرب اور سپلٹ میں مل چکا ہے) جب سے ان نوجوانوں نے جہاد کا راستہ اختیار کیا ہے اور جنگی قیادت سنبھالی ہے سربوں اور کروٹوں سے بہت سے علاقے واپس لیے ہیں اور اب یہ اپنے شہروں کا اس قدر جاں توڑ دفاع کر رہے ہیں کہ بے پناہ گولہ باری کے باوجود سربوں اور کروٹوں کو یہ ہمت نہیں ہو رہی کہ وہ کسی نئے علاقے پر قبضہ کر لیں۔ یہ جہاد کی برکت ہے اور اس کی بدولت روز بروز بوسنیا کے حالات میں استحکام پیدا ہو رہا ہے۔ اس چیز نے دنیا بھر کو انگشت بدنداں کر دیا ہے کہ کس طرح نہتے اور ضروریاتِ زندگی سے محروم لوگ سربوں اور کروٹوں کی مسلح آرمی اور اقوامِ متحدہ کی فوجوں کی کھلم کھلا سربوں کے حق میں جانبداری اور امریکہ اور مغرب کی خوفناک سازش کا مقابلہ کر رہے ہیں اور اسے ناکام بنائے جا رہے ہیں۔

جہادِ کشمیر

جذبۂ جہاد ہی ہے جس نے کشمیری قوم کو راکھ کا ڈھیر ہو جانے کے بعد انتہائی باہمت اور جانباز و سرفروش بنا دیا ہے۔ بھارت نے ۴۵ برس تک اس قوم کی برین واشنگ کی۔ اسے تن آسان، اخلاق باختہ اور اپنا خیمہ بردار بنانے کے لیے اربوں روپے خرچ کیے۔ تعلیمی پروگراموں، معاشی منصوبوں، معاشرتی اصلاحات اور سیاسی ہارس ٹریڈنگ کے ذریعے قطعی طور پر بے حس، بے ضمیر اور بے مقصد بنانے کے ہزاروں جتن کیے اور پھر ساتھ ہی دنیا بھر میں یہ ڈھنڈورا پیٹا کہ کشمیر کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے۔ کشمیری قوم بھارت کا جز بن چکی ہے اور کشمیری سیاستدان حقِ خود ارادیت کا نام تک لینا اور پاکستان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ بھارت کے گھاگ دانشور اور تجربہ کار سفارت کار اور منجھے ہوئے اہلِ قلم دنیا کو یقین دلاتے رہے کہ کشمیر، خود کشمیریوں نے بھارت میں شامل کر رکھا ہے۔ اب وہاں کوئی جھگڑا نہیں ہے، بلکہ کشمیر کو خطۂ حسن و جمال جان کر

وہاں سیاحت کے لیے جایا جائے۔

آخرکار کشمیری قوم کو ان سپوتوں نے' جن کی تربیت کشمیر کی تحریکِ اسلامی اپنے تعلیمی اداروں میں کر رہی تھی' اپنے مسئلے کو طاقِ نسیان سے نکال کر بین الاقوامی چوراہے پر لا کر رکھ دیا ہے اور اس راستے میں انھیں ۳۰ ہزار سے زائد افراد کی شہادت دینی پڑی ہے اور ابھی تک دیے جا رہے ہیں۔ ان کی خواتین کی اجتماعی آبروریزی' خانہ سوزی اور نظربندی کے واقعات تو شمار سے باہر ہو چکے ہیں۔ ان کی عبادت گاہیں تک محفوظ نہیں ہیں۔ مگر کیا کہنے جذبۂ جہاد کے جو لحہ لحہ فزوں ہوتا جا رہا ہے۔ حزب المجاہدین اور تحریکِ حریتِ کشمیر کے پروانے آخری بازی لگا رہے ہیں اور اب بڑی طاقتیں پریشان ہو گئی ہیں کہ جہاد کی آگ کو کیسے فرو کیا جائے۔ انھیں یاسر عرفات جیسے ملت فروش کی تلاش ہے۔ ان کی نظر کبھی کسی شخصیت پر پڑتی ہے اور کبھی کسی پر۔ ہمیں امید ہے کہ جس طرح بعض فلسطینی رہنما عالمی سازش کے جھانسے میں آگئے ہیں' کشمیر میں یہ ڈرامہ نہیں دہرایا جائے گا۔

دیگر جہادی تحریکیں

جہاد کی ایک بھٹی تاجکستان میں بھڑک اٹھی ہے۔ وہاں بھی ان شاء اللہ تاجک مجاہدین روسی فوج اور تاجک کمیونسٹوں اور ان کے ازبک حامیوں کے ساتھ وہی کچھ کریں گے جو افغان مجاہدین نے سوویت یونین کے ساتھ کیا۔ جنوبی فلپائن بھی عرصہ طویل سے بنگسا مورو مجاہدین کے قدموں کی چاپ سن رہا ہے۔ وہاں منیلا کے متعصب عیسائی ان کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر سلامت ہاشم جیسے جری رہنما اپنی قوم کو مسلسل جہاد کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اراکان (جنوبی برما) میں بھی روہنگیا سالڈیریٹی آرگنائزیشن اراکان کو برمی بدھوؤں اور کمیونسٹوں کے پنجۂ استبداد سے نکالنے کے لیے جدوجہد کا آغاز کر چکی ہے۔

قوم پرستی کا خاتمہ

دورِ انحطاط میں سب سے بڑی بیماری جو امتِ مسلمہ کے اندر پھیلی وہ قوم پرستی تھی۔ استعماری طاقتوں نے آکر اس کے اندر مزید اضافہ کیا۔ "قوم پرستی" اس عقیدے اور تہذیب کو ملیامیٹ کر دینے والی بیماری ہے جس عقیدے اور تہذیب کو اللہ کے رسولؐ نے بڑی محنت سے عربوں کے اندر جاگزیں کیا اور پھر ان کے ذریعے عقیدۂ اسلام ہی کی اساس پر امت قائم کی جسے "خیر امت" کہا گیا۔ دورِ جاہلیت میں تو انسانی امتیازات زبان و نسل اور رنگ و علاقہ کی بنیاد پر قائم

کیے جاتے تھے' بلکہ ایک ہی زبان بولنے والے اور ایک ہی علاقے میں بسنے والے قبائل نسلی اختلاف کی بنا پر باہم دست و گریباں ہو گئے۔ قریش و بنو ثقیف' اوس و خزرج اور بنو خزاعہ اور بنوبکر ایک ہی زبان' ایک ہی علاقے اور ایک ہی تاریخ کے وارث تھے مگر باہم برسرِپیکار تھے اور ایک دوسرے پر تفاخر و تفاضل ان کا شیوہ تھا۔ اور پھر عرب قبائل اپنے آپ کو عجمی قبائل پر برتر سمجھتے تھے۔ اس قوم پرستی اور قبیلہ پرستی نے انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے اور خونریزی' جنگ و جدل اور بے جا تعلّی کو جنم دے کر انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی روک دی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ جدوجہد میں اس بیماری کا قلع قمع کر دیا اور فخر و فضیلت کی بنیاد زبان و نسل اور علاقہ و رنگ کے بجائے عقیدے کی پختگی اور تقویٰ و شرافت میں سبقت پر استوار کر دی۔ عربی و فارسی اور رومی و افریقی سب یکساں ہو گئے۔ نہ رنگ کا امتیاز باقی رہا اور نہ زبان کا۔ عربوں کے اندر بھی جلیل القدر ہستیاں اسلامی تہذیب کو چار چاند لگاتی رہیں اور عجمیوں کے اندر بھی ایسے ماہتاب و آفتاب اٹھے جنھوں نے تفسیر و حدیث' فقہ و قانون' حکمت و فلسفہ اور علم و فن میں امتِ مسلمہ کو پوری انسانیت پر بالا کر دیا۔ زیلع (اریٹریا) کا صاحبِ نصب الرایہ اور بخارا (ازبکستان) کا امام بخاریؒ' اندلس کا صاحب الموافقات شاطبیؒ اور دہلی کا صاحب **الحجۃ اللہ البالغۃ**' شاہ ولی اللہؒ دہلوی اس گلدستۂ امت کے یکساں قابلِ فخر' یکساں چشمۂ فیض اور یکساں مرجعِ ہدایت شخصیتیں تھیں۔

عہدِ استعمار میں قوم پرستی کا ظہور

صدیوں تک ان رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ کرۂ ارض پر اپنی خوشبو بکھیرتا رہا۔ بے شک درمیان میں کبھی کبھی محدود پیمانے پر نسبی اور لسانی نعرے سر اٹھاتے رہے' مگر عقیدۂ اسلام کی قوت کے آگے وہ اٹھتے اور مرجاتے۔ جیسے جیسے عقیدے میں کمزوری اور دینی گرفت میں ضعف پیدا ہوتا گیا قومی اور نسلی نعرے ابھرتے گئے۔ استعماری طاقتوں نے آکر ان نعروں کو خوب ہوا دی اور مسلمانوں کی امتِ واحدہ کو سینکڑوں اقوام و ملل میں بانٹ کر رکھ دیا۔ پہلے عربوں اور غیر عربوں کے اندر امتیاز برپا کیا۔ عرب قومیت کو عربوں کے اندر ہوا دی اور تورانی قومیت کو ترکوں کے اندر پھیلایا اور دونوں میں باہمی جنگ بھڑکا دی۔ عربوں نے ترکوں کو مارا اور ترکوں نے عربوں سے عداوت کو شیوہ بنا لیا۔ پھر عربوں کو باہم تقسیم کیا۔ استعمار نے مصر میں فرعونی قومیت اور قبطی قومیت اٹھائی' شام میں فینقی قومیت کو ابھارا' عراق میں بابلی اور اشوری نسل کو مابہ الامتیاز پیمانہ قرار دیا' لبنان میں قدیم یونانیوں اور رومیوں کے گڑے مردے اکھاڑے' شمالی افریقہ (تونس' الجزائر

اور مراکش) میں عرب اور بربر کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ حالانکہ امام شافعیؒ کا مصر' امام ابو حنیفہؒ کا عراق' امام زھریؒ کا شام' امام اوزاعیؒ کا لبنان' ابن خلدونؒ کا تونس' یوسف بن تاشفینؒ کا مراکش سب عربی اللسان ملک اور عقیدۂ اسلام کی حامل اقوام اور امتِ مسلمہ کے دست و بازو تھے۔ جزیرۃ العرب جسے گہوارۂ اسلام کہا جاتا ہے' نسلوں اور علاقوں میں بٹ گیا۔ حجاز و نجد' صنعا و عدن اور شرقی و غربی کی آوازیں اٹھیں۔ ان آوازوں کے پیچھے محض علاقوں کی تشخیص نہ تھی' بلکہ علاقائی عصبیت بھی کارفرما تھی۔ وسطِ ایشیا میں ترک مسلمان آباد تھے' مگر انھیں ازبک' تاجک' قرغیز' قازق' ترکمان اور آذری و غیر آذری اور شیشانی و انگوشی قوموں کے القاب دیے گئے اور ان کے درمیان نفرت کے پہاڑ حائل کر دیے۔

امتِ واحدۃ کی بحالی کی جدوجہد

قوم پرستی کی یہ جاں لیوا بیماری مسلمانوں کو مضمحل کر چکی تھی۔ اس نے وسیع و عریض امت کے درمیان تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بڑی بڑی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں اور ابھی تک یہ دیواریں قائم ہیں۔ تحریکِ اسلامی نے ملتِ اسلامی کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں ان میں یہ خدمت سرفہرست ہے کہ اس نے "امتِ واحدہ" کے تصورِ خوابیدہ کو بیدار کیا ہے۔ اور مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اور ترکی سے لے کر صومالیہ تک' بلکہ مدغاسکرو ماریشس تک بسنے والے مختلف رنگ و نسل کے مسلمانوں کو ایک امت ہونے کا احساس دلایا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جہاں اسلامی عقیدہ بیدار ہو گیا ہے وہاں نسلی و لونی تفرقے مٹ چکے ہیں اور جیسے جیسے تحریکوں کا کام پھیلتا جا رہا ہے' یہ تفرقے محو ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکوں کے قائدین' ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور حسن البناؒ کسی مخصوص قوم یا ملک کے رہنما نہیں' بلکہ پوری ملت کے چشم و چراغ سمجھے جاتے ہیں۔ سیّد قطب' بدیع الزماں نورسی' ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی' شیخ محمد محمود الصواف' عبدالحمید بن بادیس' محمد البشیر الابراہیمی اور عزالدین القسام (اللہ ان سب پر اپنی رحمت نازل فرمائے) کے ساتھ عقیدت کا دائرہ پوری اسلامی دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تحریریں اور کاوشیں کسی مخصوص علاقے اور مخصوص تمدن کی پابند نہیں ہیں' بلکہ پوری امت کے مسائل سے بحث کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہر جگہ نسلِ نو ان کو اپنے سینے سے لگاتی ہے۔ دورِ حاضر کے موجودہ قائدین بھی ایک ہی گروہ اور ایک ہی جماعت شمار کیے جاتے ہیں۔ پاکستان کی جماعتِ اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد' بنگلہ دیش کی جماعتِ اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم' بھارت کی جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا سراج الحسن' مقبوضہ

کشمیر کے رہنما سیّد علی گیلانی' آزاد کشمیر کی جماعتِ اسلامی کے امیر عبدالرشید ترابی' ملائشیا کی اسلامک پارٹی کے سربراہ فاضل نور' افغان مجاہدین' خلیجی ممالک کے اسلامی رہنما' اردن میں اخوان المسلمون کے مراقبِ عام محمد عبدالرحمٰن خلیفہ' لبنان میں جماعۃ اسلامیہ کے امیر فتحی یکن' اخوان المسلمون کے مرشد عام محمد حامد ابو النصر' اسلامک نیشنل فرنٹ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر حسن ترابی' تونس کی نہضت اسلامی کے جلاوطن امیر راشد الغنوشی' الجزائر کے اسلامک سالویشن فرنٹ کے نظربند سربراہ ڈاکٹر عباس مدنی' ترکی کی رفاہ پارٹی کے صدر نجم الدین اربکان' وسطِ ایشیا کی جمہوریتوں اور وفاقی روس کے مختلف علاقوں کی اسلامی تحریک حزبِ نہضت کے صدر احمد القاضی' تاجکستان کے رہنما شریف ہمت زادہ اور یورپ و امریکہ میں رہنے والے مسلم رہنما ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ یہ ایک ہی کارواں ہے جس کے اصل قائد جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جس کا منشور اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے' جو اسی کارواں کا تسلسل ہیں جو عہدِ صحابہ اور عہدِ تابعین سے چلا آ رہا ہے۔ جس کی قیادت اپنے اپنے دور میں آئمہ کرام' مجددینِ عظام اور مصلحینِ امت کرتے رہے ہیں۔ یہ کارواں قومیتوں سے پیدا ہونے والے امتیازات اور جاہلی تعصبات کی دیواروں اور جغرافیائی حد بندیوں کو ختم کر کے امت کے ہر ہر گروہ کو باہم پیوستہ کر رہا ہے۔ اور اسے وہی حیثیت دینا چاہتا ہے جو حدیث میں بیان کی گئی ہے کہ جسم کے ایک حصے کو تکلیف پہنچے تو دوسرا حصہ بھی تکلیف اور بے خوابی میں مبتلا ہو جائے۔ فلسطین کے مسلمانوں کی تکلیف ہو یا بوسنیا کے مسلمانوں کی آزمائشیں' کشمیریوں پر ٹوٹنے والا ظلم و ستم ہو یا تاجکستان پر لہرانے والی شمشیرِ ستم' اراکانی مسلمانوں کے زخم ہوں یا فلپائنی مسلمانوں کی لرزہ خیز داستان' ساری ملت اس میں حصہ دار ہے۔ کیا اسلامی تحریک کا یہ کارنامہ اس دور کا سب سے بڑا معجزہ نہیں ہے؟ اس معجزے کی شب تاب شعائیں دنیا نے جہادِ افغانستان میں دیکھیں جس میں افغانیوں کے دوش بدوش پوری دنیا کی اسلامی تحریکوں کے نوجوانوں نے بھی اپنا خون بہایا' اور آخرکار سوویت یونین کا "قصرِ پرشکوہ" دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو گیا۔

حالاتِ حاضرہ

ترکی کے بلدیاتی انتخاب

مسلم سجاد

دنیا کے نقشے پر کتنے ہی ملک واقع ہیں' جہاں بلدیاتی انتخابات منعقد ہوتے ہیں اور بین الاقوامی پریس میں اس کی خبر بھی نہیں آتی' لیکن ۲۷ مارچ کو ترکی میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات پر مغربی پریس کی پہلے سے نظر تھی۔ شاید انھیں احساس تھا کہ الجیریا میں اسلامی قوتوں کی برتری کا پہلا اظہار بلدیاتی انتخابات میں ہوا تھا۔ اس کے بعد انھیں روکنے کے لیے تدابیر اختیار کی گئیں' لیکن اس کے باوجود جب قومی انتخابات کے پہلے مرحلے میں اسلامی فرنٹ (FIS) کو واضح کامیابی حاصل ہوئی تو سب لبادے اتار کر کارروائی کرنا پڑ گئی۔ ترکی میں ۱۹۹۶ میں عام انتخابات ہونا ہیں۔ موجودہ بلدیاتی انتخابات کی حقیقی اہمیت یہی ہے کہ اس سے عوام کی سوچ کا اظہار ہو گا اور پتا چلے گا کہ ترک عوام آئندہ اپنے ملک کو کس رنگ میں رنگا دیکھنا چاہتے ہیں۔

ترکی میں اسلامی قوتوں کی ترجمان رفاہ پارٹی ہے' اس کے لیڈر نجم الدین اربکان منجھے ہوئے سیاستدان ہیں۔ اس سے قبل مخلوط حکومتوں میں دو دفعہ نائب وزیر اعظم رہ چکے ہیں' اس وقت قومی اسمبلی میں ۴۰ ممبروں کے قائد ہیں۔ بلدیاتی انتخابات میں ان کی پارٹی واضح پروگرام کے ساتھ میدان میں اتری' اور ۱۹۸۹ کے بلدیاتی انتخابات کے ۹ فی صد کے مقابلے میں دگنے سے زائد تقریباً ۱۹ فی صد ووٹ حاصل کیے۔ لندن کے ماہنامہ امپیکٹ (مارچ ۹۴) نے لکھا تھا کہ اگر رفاہ پارٹی ۱۸ فی صد یا زائد ووٹ حاصل کرلے تو ترکی کی سیاست میں حقیقی تبدیلی آجائے گی۔

ترکی کی آبادی ۶ کروڑ ہے۔ ان انتخابات میں ۳ کروڑ افراد کو ووٹ ڈالنا تھے۔ ترکی میں ووٹ ڈالنا قانوناً لازمی ہے۔ ۷۶ شہروں کے میئر کے ساتھ ساتھ' صوبائی اسمبلی' سٹی کونسل' دیہاتوں کے مکھیا اور دیگر نشستوں کے لیے کل ۸۳ ہزار نمائندوں کا انتخاب ہونا تھا۔

۷۶ میں سے ۲۸ شہروں میں رفاہ پارٹی کے میئر منتخب ہوئے' لیکن ان میں زیادہ اہم اور سیکولر عناصر اور ان کے مغربی سرپرستوں کے لیے ناقابلِ یقین استنبول (سابقہ قسطنطنیہ) اور انقرہ کے

نتائج تھے۔ مہم کے دوران نجم الدین اربکان کہتے تھے کہ پانچ سو سال بعد اسلام قسطنطنیہ کو دوبارہ فتح کرے گا' اور یہ ہو گیا۔ استنبول ترکی کا اہم تجارتی مرکز ہے' آبادی ایک کروڑ ہے' طیب اردگان اس شہر کے میئر منتخب ہوئے ہیں۔ آخری دنوں میں جب رفاہ کی کامیابی کا امکان نظر آیا تو سرکاری ٹیلیویژن اور سیکولر اخبارات نے اردگان کے خلاف جھوٹے الزامات کی غیر معمولی مہم چلائی۔ فتح کے بعد اردگان نے کہا کہ عوام نے میڈیا کو شکست دے دی ہے۔ مصطفےٰ کمال کے قائم کیے ہوئے دارالخلافہ انقرہ میں رفاہ کی کامیابی اتنی ناقابل یقین تھی کہ برطانیہ کے اخبار گارجین کے مطابق ٹی وی نے کئی گھنٹے انتظار کر کے "سقوط انقرہ" کا اعلان کیا (۲ اپریل ۱۹۹۴)۔

انتخابات میں خاتون وزیر اعظم سلر کی ٹروپاتھ پارٹی کو ۱۹۹۱ کے ۲۷ فی صد کے مقابلے میں ۲۲ فی صد' اور مخلوط حکومت میں ان کی اتحادی پارٹی سوشل ڈیموکریٹک پیپلز پارٹی کو ۲۰٫۸ فی صد کے مقابلے میں ۱۳٫۴ فی صد ووٹ ملے۔ عام اندازے یہ تھے کہ سرکاری پارٹیوں کو اتنے ووٹ بھی نہیں ملیں گے۔ اور حکومت میں تبدیلی آسکتی ہے اور نئے انتخابات ہو سکتے ہیں' لیکن موجودہ نتیجہ کو حکومت اعتماد کا ووٹ قرار دے رہی ہے۔ مدر لینڈ پارٹی ۱۹۹۱ کے ۲۴ فی صد کے مقابلے میں ۲۰٫۹ فی صد ووٹ لے کر دوسرے نمبر پر رہی۔ آئندہ انتخابات کے لیے رفاہ کے خلاف مدر لینڈ اور ٹروپاتھ پارٹیوں میں اتحاد کی بات سامنے آنا شروع ہو گئی ہے۔ رفاہ تیسرے نمبر پر آئی۔ ۱۹۹۱ کے ۱۶٫۹ فی صد کے مقابلے میں ۱۸٫۸ فی صد ووٹ ملے۔ بلند ایجوت کی ڈیماکریٹک لیفٹ کو ۱۰٫۵۸ فی صد کے مقابلے میں ۸٫۷ ووٹ ملے۔ دیگر قابلِ ذکر پارٹیاں نیشنل ایکشن پارٹی (۸٫۱ فی صد) اور ری پبلکن پیپلز پارٹی (۴٫۷ فی صد) ہیں۔ (اکنامسٹ ۳ اپریل ۹۴)

رفاہ پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ اور دو اہم ترین شہروں میں اس کی کامیابی' تبصرہ کا اصل موضوع ہے۔ امریکی ہفت روزہ نیوز ویک نے اسے سیکولر نظام کے لیے شدید دھچکا قرار دیا ہے' اور لکھا ہے کہ ترکی کے اسلام پسند بھی بحیرہ روم کے مسلمان ساحل پر واقع تمام حکومتوں کو چیلنج کرنے والی سیاسی تحریک کے ہراول دستہ میں شامل ہو گئے۔ (۱۱ اپریل ۱۹۹۴)

برطانیہ کے انڈی پینڈنٹ نے سرخی لگائی کہ مسلم انقلابیوں نے قوم کے یورپی سیکولر امیج کو چیلنج کر دیا ہے۔ بلدیاتی انتخابات کے ان نتائج نے اس کشمکش کو پھر واضح کر دیا ہے کہ جو آج پوری امت مسلمہ میں اور امت مسلمہ کے ہر ملک میں برپا ہے۔ ترکی اس سے مستثنیٰ نہیں بلکہ غیر معمولی تاریخی پس منظر کی وجہ سے یہاں کی کشمکش اور اس کے نتائج کے اثرات بھی غیر معمولی ہیں۔ ترکی' چار سو سال خلافت عثمانیہ کا مرکز رہا اور اس کے بعد مصطفےٰ کمال کے روپ

میں اسے ایسا حکمران ملا جس نے ترکی سے اس کی شناخت چھین لی' خلافت ختم کی' یورپی پینل کوڈ نافذ کیا' رومن رسم الخط رائج کیا' پردہ زبردستی ختم کروایا' عربی میں اذان دینے کی ممانعت کی۔ غرض ترک معاشرہ کی ماہیت ِقلب کر دینے کی کوشش کی گئی۔ اسے ایک مغربی معاشرہ بنا دیا گیا۔ جہاں شراب کھلے عام ملتی ہے' شہروں میں راتیں رنگین ہوتی ہیں اور ساحلوں پر یورپی سیاحوں کی ریل پیل ہوتی ہے۔ اس کے لیے جو ظلم کیا گیا ہو گا اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ اتاترک تھا' اور ہم نے اپنی درسی کتابوں میں اس کا تذکرہ ترک قوم کے محسن اور معمار کی حیثیت سے ہی پڑھا۔ ۵۰ کے عشرے سے ترکی نے اپنی حقیقی شناخت دریافت کرنے کا سفر شروع کیا۔ ترکی دستور اس طرح کا لادینی دستور ہے کہ اسلام کی بنیاد پر کوئی سرگرمی خلافِ قانون اور قابلِ سزا قرار پاتی ہے۔ ان حالات میں وہاں احیائے اسلام کی جدوجہد کا آغاز ہوا جو آج اس مرحلہ تک آپہنچی ہے کہ ہر طرف خطرہ کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی ہیں۔

ترکی نیٹو کا ممبر ہے اور یورپی برادری کا ممبر بننے کے لیے اس کی درخواست زیرِ غور ہے۔ وہ یورپ میں شامل ہونا چاہتا ہے اور یورپ اسے اپنا تسلیم نہیں کرتا۔ آج کل یورپی ممالک خصوصاً جرمنی میں ترکوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ ایک الگ کہانی ہے۔ لیکن ان انتخابات کے بعد بھی ایک صاحبِ قلم نے لکھا کہ یورپ ہمارے لیے سورج ہے اور ہم' سورج مکھی کے پھول کی طرح' ہمیشہ اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ گذشتہ اکتوبر میں ترکی کی وزیرِ اعظم نے امریکہ کا دورہ کیا اور تجزیہ نگاروں کی رائے میں ناکام واپس آئیں۔

اس کے بالمقابل رفاہ پارٹی نے ترک قوم کو اس کی اصل شناخت کی طرف بلایا ہے۔ وہ انقلابی تبدیلیوں کی علمبردار ہے۔ ترک عوام کے لیے اس کی حیثیت ہوا کے تازہ جھونکے کی ہے۔ دوسری پارٹیاں آزمائی جا چکی ہیں۔ ان کی ناکامیاں اور بدعنوانیاں زبان زد ہیں۔ رفاہ کا امیج صاف ستھری' دیانتدار اور باصلاحیت قیادت کا ہے۔ رفاہ پارٹی نیٹو سے علیحدگی چاہتی ہے۔ یورپی برادری میں شامل ہونے کی مخالف ہے' اور اسلامی ممالک سے خصوصاً ایشیا کی ترک ریاستوں سے روابط بڑھانے کی حامی ہے۔ کرد مسئلہ کو بھی اخوتِ اسلامی کی بنیاد پر حل کرنے کی داعی ہے۔ بلا سود بنکاری پر مبنی معاشی نظام قائم کرنا چاہتی ہے۔ نجم الدین اربکان نے کھلے عام کہا کہ دوسری پارٹیاں مغرب کی نقال اور امریکہ کی غلام ہیں۔ رفاہ پارٹی نے ترک معاشرہ میں ایک اہم مقام بنا لیا ہے اور عوام کی نظروں میں متبادل قیادت کی حیثیت سے آگئی ہے۔

ترکی کے سیکولر عناصر اور نام نہاد دانشوروں کو جمہوریت کے دعووں کے باوجود یہ گوارا نہیں

ہے کہ اگر عوام اپنی زندگی اسلامی اقدار کے مطابق گزارنا چاہیں اور اپنے لیے ایسے ہی نمائندے منتخب کریں تو ان کے لیے جگہ خالی کر دیں۔ گزشتہ ۳۵ سال میں فوج تین دفعہ مداخلت کر چکی ہے۔ رفاہ کی مقبولیت دیکھتے ہوئے اخبارات میں یہ تذکرے آنے لگے کہ انھیں روکنے کے لیے فوج کو مداخلت کرنا پڑ سکتی ہے اور الجیریا جیسی "خانہ جنگی" کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ گویا عوام کو بلیک میل کیا گیا کہ رفاہ کو ووٹ دیا تو ان کو تو حکومت ملے گی نہیں فوج آکر رہی سہی جمہوریت کو بھی لپیٹ دے گی۔ دوسری طرف ڈیماکریٹک لیفٹ کے بلند ایجوت کو یہ پریشانی ہے کہ رفاہ نے فوج میں اپنا ہمدرد گروپ بنا لیا ہے۔ انھوں نے رفاہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے اور یہ الزام لگا رہے ہیں کہ "اس نے فوج کو سیاست میں الجھانے کی کوشش کی ہے بلکہ سیکولر اور ری پبلکن اصولوں کے خلاف غیر قانونی فوج تشکیل دے رہی ہے۔"

شہروں کے جو میئر منتخب ہوئے ہیں ان کے محدود دائرۂ اختیار میں تعلیم، پولیس، لائسنس دینے کے قوانین نہیں آتے۔ بڑے شہروں میں نائٹ کلب، قحبہ خانہ اور شراب خانہ مغربی اثرات کی علامت ہیں اور اسلامی جذبہ رکھنے والوں کا ہدف ہو سکتے ہیں۔ فوراً ہی یہ خبریں بھی آگئیں کہ نوجوانوں نے مغربی لباس پہنے عورتوں کو بسوں سے اتار دیا۔ لیکن ساتھ ہی ایک شہر بے اوگلو کے میئر کا یہ اقدام بھی ہے کہ اس نے سب سے پہلے شہر کے عیسائی محلے سے کوڑا کرکٹ اٹھانے کے لیے گاڑیاں بھیج دیں۔ رفاہ پارٹی کو معتدل بتایا جا رہا ہے۔ یہی بات کہ ان کے لیڈر سوٹ پہنتے ہیں اس کی علامت قرار دی جاتی ہے۔ ایک کالم نگار کے مطابق ترکی کو ارکان مل سکتا ہے لیکن ترکی میں خمینی نہیں آسکتا۔ مستقبل کی کشمکش کا اندازہ اناطولیہ نیوز ایجنسی کی اس خبر سے ہو سکتا ہے کہ وزیر داخلہ نے انقرہ اور استنبول کے میئروں کو متنبہ کیا ہے کہ اگر انھوں نے ترکی کے سیکولر دستور کو گزند پہنچانے کی کوشش کی تو ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ کچھ اس توقع میں ہیں کہ رفاہ اپنے پروگرام پر عمل کرے گی تو لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس پس منظر میں آنے والا دَور رفاہ کی قیادت کے فہم و فراست، حکمت و دانش اور ایمان اور صبر کی آزمائش کا دَور ہو گا۔ انھیں اپنی حمایت کی بنیادوں کو وسیع سے وسیع تر کرنا ہے۔ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کو بھی اپنا ہمنوا بنانا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی ردِّعمل کا صحیح صحیح اندازہ کرنا ہے اور پھر اپنے لیے راستہ بنانا ہے۔ ۱۹۹۶ تک کے دو سال دراصل قومی انتخابات کی تیاری کا عرصۂ کار ہے اور ان دو برسوں میں جو کچھ بھی کیا جائے گا اس کے نتائج جلد ہی سامنے آجائیں گے۔

رسائل و مسائل

انکم ٹیکس اور حالتِ اضطرار

میں رسائل و مسائل میں مولانا مودودیؒ کا انکم ٹیکس کے بارے میں جواب پڑھ رہا تھا، مولاناؒ نے یہ جواب غالباً ۱۹۴۳ء کے عشرے میں دیا تھا۔ آج کل صورتِ حال اتنی خراب ہے کہ جو افسر بھی آتا ہے وہ رشوت وصول کرنے کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ براہِ مہربانی آپ اپنے قیمتی وقت میں سے چند لمحات نکال کر موجودہ حالات میں ٹیکس کی ادائیگی' اس سلسلے میں رشوت وغیرہ کی ادائیگی' اور ان سے بچنے کی جہاں تک ممکن حد ہے ان تمام چیزوں کے متعلق آگاہ فرمائیں۔

شرعی پوزیشن تو کوئی صاحب افتا ہی بتا سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں انکم ٹیکس کے سلسلہ میں مسائل کو حل کرنے کے لیے کیا اور کتنی گنجائش نکل سکتی ہے۔ میں چند اصول آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ ان کو سامنے رکھ کر آپ خود اپنے دل سے فتویٰ پوچھ کر اپنی راہِ عمل متعین کر سکتے ہیں۔ بالآخر اللہ کے سامنے جواب آپ ہی کو دینا ہے' مطمئن بھی اسی کو کرنا ہے۔

۱۔ جو کام شریعت میں جائز نہیں' کوئی اسے جائز نہیں بنا سکتا۔ جھوٹ' غلط بیانی' ۔۔۔ دکھ دہی جیسے اعمال جائز نہیں۔ اس طرح رشوت' سود' شراب کو بھی کوئی جائز قرار نہیں دے سکتا۔

۲۔ ان کی گنجائش اگر نکل سکتی ہے تو حالتِ اضطرار میں' اور حالتِ اضطرار کے سلسلہ میں کوئی عمومی فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو ہر فرد کے اپنے مخصوص حالات پر منحصر ہے' اور ہر کیس کی نوعیت پر۔

۳۔ عمومی طور پر بھی کچھ اصول موجود ہیں' جن کا تعین فقہا نے کیا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اگر مضرت ایسی ہو جس کا دفع کرنا ناگزیر ہو' مثلاً جان پر بنی ہو' کوئی متبادل

ذریعۂ معاش نہ ہو' معاش تباہ و برباد ہوتی ہو' وغیرہ وغیرہ' تو بحالتِ اضطرار کوئی ممنوع کام کیا جا سکتا ہے۔ جائز وہ پھر بھی نہ ہو جائے گا' اور استغفار کرتے رہنا چاہیے۔ یا پھر کوئی ایسا حق ہو جس کا لینا ناگزیر ہو' اور بلا ناجائز کام کے کوئی صورت نہ ہو۔ غیر باغ و لا عاد (بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے) کی شرط بھی ہے۔

۴۔ اپنے حالات دیکھیے' درج بالا اصول سامنے رکھیے' اپنے لیے جو طرزِ عمل مناسب سمجھیں وہ اختیار کیجیے۔ بالآخر اپنے عمل کے لیے آپ ہی جواب دہ ہیں۔ مفتی فتویٰ دے دے' پھر بھی آپ کی ذمہ داری ختم نہ ہو گی۔ آپ کے گناہ کا بار مفتی نہ اٹھائے گا۔ اس لیے اس قسم کے حالات میں سوال کرنے کے بجائے خود ہی فیصلہ کرنا بہتر ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے احساس کے ساتھ' جو کوئی مشکل کام نہیں۔ ضمیر اور دل کی خلش برقرار رہنا چاہیے۔ اسے مطمئن کر کے سلانے کی کوشش نہ کریں۔

(خرم مراد)

کتاب نما

یادگار لمحات : از عاصم نعمانی۔ ناشر : ادارہ معارف اسلامی۔ تقسیم کنندہ : المنار بک سنٹر' منصورہ' ملتان روڈ' لاہور۔ صفحات ۴۰۷۔ قیمت ۷۹ روپے۔ (کتاب کا پورا نام : "سید مودودیؒ کے ساتھ گزرے ہوئے یادگار لمحات۔")

جناب عاصم نعمانی ان خوش نصیب حضرات میں سے ہیں جو مولانا سید مودودی علیہ الرحمۃ کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ خصوصاً دور آخر میں تو نعمانی صاحب ہی دفتری ماحول میں قریب تر رہے اور دفاتر کے منصورہ میں منتقل ہو جانے کے بعد' مولانا کے کمرے سے ملے ہوئے کمرے میں وہ ان کے معاون خط و کتابت و متفرقات تھے۔ میں ذرا فاصلے پر مشرقی جانب کے دفاتر میں بیٹھتا تھا۔ حتیٰ کہ سید رحمہ اللہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد بھی ہم وہاں یہی سمجھ کر کام کرتے رہے کہ جیسے مولاناؒ اسی طرح اپنے دفتر میں مصروف مطالعہ و تحریر ہیں۔

عاصم نعمانی صاحب نے بڑا اہم کام کیا۔ ۱۹۶۲ کے آخر میں بطور ٹائپسٹ کلرک کام شروع کیا۔ ۱۹۷۴ میں' جب مرکز جماعت منصورہ منتقل ہوا تو پھر ان کو مولانا کی عصرانہ گفتگوؤں اور دوسرے امور کی ڈائری لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ پہلے کے واقعات کے بارے میں بھی معلومات اور اپنی یادیں سمیٹیں' اور احوال روز مرہ کو نوٹ کرنا شروع کیا۔ یہ کتاب اسی محنت کا ثمر ہے۔ دیکھیے' میں کہیں کہیں سے' ۸ صفحے کی فہرست عنوانات سے متفرق طور پر بعض کو پیش کرتا ہوں۔

"ہلٹن ہوٹل میں استقبالیہ" (برطانیہ میں) ---- "مراکش روانگی اور وہاں تعلیمی کانفرنس میں پیش کردہ تجاویز" ---- "مولانا مدنی کے ساتھ گستاخانہ رویہ کی مذمت" (واقعہ قبل تشکیل پاکستان) ---- "امریکی پادری سے اسلامی تعلیمات پر گفتگو" ---- "دست شناسی کے بارے میں" ---- "صحیح مسلم کے بارے میں ایک سوال کا جواب" ---- "چاند پر قبلہ رخ؟" ---- "ڈارون کا نظریہ غیر سائنسی ہے" ---- "این ' آئی' ٹی کے بارے میں" ---- "تقدیر دو قسم کی ہے' مبرم' معلق

--- "الزامات اور گالیوں کے جواب میں خاموشی" --- "خواب کے بارے میں مولانا کی رائے" --- "ریڈیو انٹرویو" --- "حالی اور سعدی کی نعتیں" --- "تاشقند سے قلم کا تحفہ" --- "اردن کے سفیر سے ملاقات" --- "کشف کے بارے میں ایک سوال کا جواب" --- "کتے کے کاٹنے کا دم" --- "تفہیم میں شامل نقشے اور انجیل برناباس" --- "بی بی سی کے نمائندے ولیم کرالے نے انٹرویو لیا" --- "دو نمائندوں کے ذریعے امام خمینی کا خط" --- "آخری سفرِ امریکہ" --- "نمازِ جنازہ"!

یعنی بہت سے مسائل کا حل' بہت سی ملاقاتوں اور شخصیتوں کا ذکر' بہت سی تاریخی یادداشتوں کا حوالہ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شخصیت و افکار اور تحریکِ اسلامی کے بارے میں خزینۂ معلومات۔ (نعیم صدیقی)

اقبال دشمنی' ایک مطالعہ: از پروفیسر ایوب صابر۔ ناشر: جنگ پبلشرز ۱۳ سر آغا خان روڈ' لاہور۔ صفحات ۳۷۶۔ قیمت ۲۰۰ روپے۔

علامہ اقبال کی مخالفت تین دائروں میں ہوتی رہی ہے: شخصیت' شاعری اور فکر۔ ان تینوں دائروں میں اقبال کے خلاف متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں اقبال مخالف لٹریچر میں سے حسب ذیل چھ کتابوں اور تین کتابچوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے: خدوخالِ اقبال (امین زبیری)' علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی (حامد جلالی)' مکائدِ اقبال' اقبال کا شاعرانہ زوال' خادمانہ و مئودبانہ تبدیلیاں (سید برکت علی گوشہ نشین) مثنوی سِرّالاسرار (خواجہ معین الدین جمیل)' اقبال' اجمالی تبصرہ (مجنوں گورکھپوری)' اقبال قلندر نہیں تھا (صائب عاصمی)۔ آخری باب ماحصل پر مشتمل ہے۔

پروفیسر ایوب صابر نے اپنے زیرِ تحقیق موضوع سے متعلق ان کتابوں' کتابچوں' مضامین اور مقالات کو پیش نظر رکھا ہے جو گزشتہ نوّے برسوں میں اقبال کی شخصیت' شاعری اور افکار و نظریات کے حوالے سے لکھے گئے۔ اقبال کے خلاف جملہ اعتراضات کا حتی الامکان جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال دشمنی کے حوالے سے سب سے زیادہ پست فکری کا مظاہرہ "خدوخالِ اقبال" میں نظر آتا ہے۔ اس کتاب کے چھیالیس اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔ چند اعتراضات یہ ہیں: اقبال کی مذہبی تعلیم معمولی تھی' عطیہ کو اپنی طرف مائل نہ کرسکے' امرا کی مدح' پیغام اور زندگی میں تضاد' جداگانہ مسلم ریاست کا تصور علامہ کا نہ تھا' مصنف اس

نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "خدوخالِ اقبال" میں لگائے گئے الزامات، تجزیے کی زد میں آکر فقط بہتان رہ جاتے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری نے دیگر ترقی پسند اور اشتراکی ادیبوں کی طرح اقبال کو رجعت پسند قرار دیا اور ان کی اسلام پسندی کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ "مکائدِ اقبال" کا مصنف، متعصب، تنگ نظر، فرقہ پرست اور کفر ساز ذہنیت کا مالک ہے، جس کے نزدیک ہر سُنّی جنمی ہے۔ یہی اندازِ فکر "خادمانہ و مودبانہ تبدیلیاں" کی بنیاد ہے۔ اگرچہ مصنف کا دعویٰ کلامِ اقبال کی اصلاح ہے لیکن یہ اصلاح فرقہ وارانہ تعصب کا مظہر بن گئی ہے۔ خواجہ معین الدین جمیل کی مثنوی "سِرّالاَسرار" وجودی فلسفے کی وکالت کرتی ہے۔ اس کے ۳۲ اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

اقبال کے مخالفین کی طویل فہرست میں بعض سنجیدہ اہل علم کے علاوہ اشتراکی نظریات کے حامل اہل قلم، قوم پرست ہندو اور بعض مسلمان علما، حاسدین اقبال، وجودی تصوف کے صوفیا، بعض مستشرقین، قادیانی، فرقہ پرست تنگ نظر اہل دین، روایتی سجادہ نشین اور پاکستان دشمن عناصر شامل ہیں۔ پروفیسر ایوب صابر نے اقبال مخالف لٹریچر کی ۲۳ کتابوں اور ۴۳ مضامین کی فہرست بھی دی ہے۔ مصنف نے عزم ظاہر کیا ہے کہ آئندہ پورے اقبال مخالف لٹریچر کا جائزہ لے کر اقبال دشمنی کے محرکات، رجحانات اور رویّوں کا جائزہ لیا جائے گا۔ مصنف کا اسلوبِ نگارش لفظی و معنوی تعقید سے پاک ہے۔ چند ایک امور کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:

(الف) ص ۴۶، ۶۵، ۲۵۲، ۲۶۶، ۲۷۱، ۳۰۳ اور بعض دوسرے مقامات پر اشعار کا متن درست نہیں ہے۔

(ب) کتابیات میں "ج۔ دیگر کتب" کے تحت انگریزی کتب میں Mementos of Iqbal کے مرتب کا نام نہیں لکھا گیا۔ اس کتاب کا اندراج "تصانیف اقبال" کے تحت ہونا چاہیے تھا۔

(ج) کتاب میں متعدد مقامات ص ۱۷۴، ۱۹۷، ۲۳۰، ۲۴۳ پر قرآنی آیات کے اعراب لگانے میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا:

ص ۲۵۲ پر چند اشعار دیے گئے ہیں مگر حوالہ ۲۲۳ غلط ہے۔ حوالہ ۲۲۴ سرے سے دیا ہی نہیں گیا۔ حوالے تصانیف اقبال کے پرانے ایڈیشنوں کے ہیں "کلیاتِ اقبال" اس مقصد کے لیے زیادہ مفید ہے۔ ذخیرۂ اقبالیات میں مولانا غلام رسول مہر کی تحریریں ایک خاص مقام کی حامل ہیں۔ مصنف نے اپنی تحقیق میں ان کی تحریروں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

کتاب لائق مطالعہ ہے۔ مصنف کی محنت لائق تحسین ہے۔ تقدیم' ڈاکٹر جاوید اقبال کے قلم سے اور مقدمہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا تحریر کردہ ہے۔ امید ہے کہ مصنف اپنے منصوبے کا دوسرا حصہ بھی جلد مکمل کریں گے۔ (ظفر حجازی)

خود نوشت حیات سرسید: مرتبہ: ضیا الدین لاہوری۔ ناشر: جنگ پبلشرز' لاہور۔ صفحات ۳۷۲۔ قیمت ۲۰۰ روپے۔

سرسید احمد خان گزشتہ صدی کی ان اولوالعزم شخصیات میں سے تھے' جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی' معاشرتی اور سیاسی زندگی پر مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے گہرے اثرات مرتب کیے۔ مگر زیر نظر نہایت دلچسپ اور اپنی نوعیت میں منفرد کتاب کے مولف کے الفاظ میں' سرسید کی "ترجمانی کرتے ہوئے ہم نے حق و صداقت سے کام نہیں لیا۔" اس کمی کو دور کرنے کے لیے مولف موصوف نے سرسید کی تحریروں' تقریروں اور بیانات سے ان کی خود نوشت مرتب کی ہے' جس سے تصویر کا ایک دوسرا رخ سامنے آتا ہے۔ مولف نے جس نقطہ نظر کے تحت یہ خود نوشت مرتب کی' وہ بڑا متوازن ہے۔ ان کے خیال میں: "اخلاقی طور پر کسی فرد کے عیوب تلاش کرتے رہنا' کسی طور مستحسن نہیں' مگر شخصیت پرستی کے زیر اثر پسندیدہ افراد کے عیوب کو خوبیوں کے کھاتے میں ڈالنا' اور ناپسندیدگی کی صورت میں خوبیوں کو عیوب کے طور پر بیان کرنا' اس سے بھی زیادہ ظلم ہے۔"

زیر نظر خود نوشت سے سرسید کی قومی و ملی اور علمی و تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ' انگریزوں کے ساتھ ان کی غیر معمولی وفاداری' اور برطانوی مفادات کی حفاظت کے لیے سرسید کی کاوشوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں سرسید کے اخلاص اور اپنی قوم کے لیے ان کی دردمندی میں شبہ کرنا مشکل ہے' مگر ان کی ذہنی افتاد نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ انگریزی "حکومت کو دوام بخشنے کے لیے (وہ ان کی) مکارانہ حکمت عملی" کا شکار ہوگئے۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں انھوں نے نہایت جانفشانی سے انگریزی حکام کی مدد کی' پرچہ نویسی کی خدمات بھی انجام دیں اور اس کے عوض سرسید کے اپنے الفاظ میں: "سرکار نے میری بڑی قدر دانی کی۔ عہدہ صدر الصدوری پر ترقی کی' اور علاوہ اس کے دو سو روپیہ ماہواری پنشن مجھ کو اور میرے بڑے بیٹے کو عنایت فرمائے اور خلعت پانچ پارچہ اور تین رقم جواہر' ایک شمشیر عمدہ قیمتی ہزار روپیہ کا اور ہزار روپیہ نقد واسطے مدد خرچ مرحمت فرمایا۔" انگریزوں کی وفاداری میں انھوں نے

اس حد تک غلو برتا کہ ۱۸۵۷ میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کو جاہل' بدمعاش' بے علم' حرامزادے' نمک حرام اور نامحمود قرار دے ڈالا ---- مصنف نے لگی لپٹی رکھے بغیر تصویر کا یہ رخ بھی' خود سرسید ہی کے الفاظ میں پیش کردیا ہے' جس سے ان کے بارے میں بہت سے دلچسپ اور چشم کشا حقائق اور ان کی اندھی انگریز پرستی کے شواہد سامنے آتے ہیں۔

کتاب نہایت کاوش و عرق ریزی سے مرتب کی گئی ہے۔ ضیاء الدین صاحب نے اصل ماخذ تک رسائی کے لیے انڈیا آفس' برٹش میوزیم اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی تک کے کتب خانوں کو کھنگالا اور پھر جملہ لوازمے کی ترتیب' ابواب بندی' عنوانات اور تائیدی و وضاحتی حواشی و تعلیقات کا کام نہایت خوبی اور خوش سلیقگی سے انجام دیا۔ کتاب میں بہت سی اہم اور نادر و نایاب تصاویر' دستاویزات اور تصانیف سرسید کی قدیم ترین اشاعتوں کے عکس شامل ہیں۔ ضیاء الدین لاہوری کی محنت و تحقیق (بہ الفاظ حالی۔ "کاں کنی") اور تالیفی ذوق بہر اعتبار قابل داد ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

اشاریہ ترجمان القرآن ۱۹۳۲ تا ۱۹۷۶: مرتبہ حکیم نعیم الدین زبیری۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی ڈی ۳۵' بلاک ۵ فیڈرل بی ایریا' کراچی۔ صفحات ۴۴۳۔ قیمت ۸۰ روپے۔

ادارہ معارف اسلامی کراچی نے کئی سال قبل "ترجمان القرآن" کی اولین ۸۵ جلدوں کے مضامین کا موضوع وار اور مصنف وار جامع اشاریہ حکیم نعیم الدین زبیری سے مرتب کروا کے شائع کیا تھا۔ یہ ایک انتہائی مفید کام ہے' اور ایک علمی اور تحقیقی ضرورت پوری کرتا ہے۔ الف بائی ترتیب سے چھ سو موضوعات متعین کرکے ۴۴ سالوں میں شائع ہونے والے تمام مضامین کے مباحث کے حوالے مرتب کیے گئے ہیں۔ کسی بھی متعلقہ موضوع پر کام کرنے والا اس دور کی تحریرات تک نہایت سہولت سے رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ مختلف افراد کے پاس اور لائبریریوں میں "ترجمان القرآن" کے شمارے اور جلدیں تو مل جاتی ہیں۔ ان سے خاطر خواہ استفادے کے لیے یہ اشاریہ بہت کارآمد ہے۔ یہ اشاریہ نہ صرف تمام لائبریریوں اور تحقیقی اداروں میں' بلکہ ہر اس شخص کی میز پر ہونا چاہیے جو اہم علمی موضوعات کے حوالے سے لکھنے پڑھنے کے کام سے متعلق ہے' یا کسی چھوٹے بڑے رسالے کی ادارت کررہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مفید کام کو آگے بڑھایا جائے اور اس اشاریے کی دوسری جلد مرتب کی جائے۔ (مسلم سجاد)

اوج نعت نمبر: سرپرست: میاں مقبول احمد (پرنسپل)' مدیر اعلیٰ: پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی' مدیر: محمد ریاض ' نائب مدیر: علی احمد' ناشر: گورنمنٹ کالج شاہدرہ ' لاہور۔ جلد اول: ۷۲۰ صفحات' جلد دوم: ۷۳۲ صفحات

آغاز میں اہم شخصیتوں کے پیغامات ' پھر ۳۲ شعرا کی حمدیں ' اور اس کے بعد آپؐ کے چچا ابو طالب سے شاہ عبد العزیز تک ۲۱ شعرا کی عربی نعتیں مع اردو ترجمہ' ۲۵ شعرا کی فارسی اور ۱۵ شعرا کی اردو نعتیں دی گئی ہے ۔ حصہ مضامین اردو ' فارسی عربی اور پنجابی اور دیگر زبانوں کے نعتیہ ذخیرے' نیز پاکستان کے مختلف شہروں کے نعت گو شعرا کی نعت گوئی کا جائزہ شامل ہے۔ نعت گو شعرا اور نعت خوانوں سے قلمی مذاکرے خاصے دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ دوسرے حصے میں ۲۵۸ اردو' اور ۳۵ پنجابی نعتوں کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی زبانوں کا نعتیہ انتخاب' اردو' پنجابی اور سندھی کتابیات نعت ' نعت پر تحقیق ' رسائل کے نعت نمبروں کا جائزہ ــــ غرض نعت کے موضوع پر تخلیقی' تحقیقی اور تنقیدی کام کا دائرہ معارف مرتب کرنے کی یہ ایک قابل قدر کاوش ہے اور مرتبین و ناشرین کو مبارک باد! (ظفر حجازی)

اسباق عمرہ و حج: از لطف الرحمٰن خان ۔ ناشر: مکتبہ سراج منیر ۲۸۷' ایف رحمان پورہ لاہور۔ صفحات ۲۰۔ قیمت ۴ روپے۔

مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں عام فہم انداز میں چند مفید نکات مرتب کیے ہیں۔ عمرہ و حج کا عزم رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ نافع ہو گا۔ یہ کتابچہ ایک روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر قرآن کالج اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن لاہور سے بطور تحفہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

وضاحت

۱۔ ترجمان القرآن میں ترجیحاً" دینی اور علمی کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۔ تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

۳۔ تبصرے کے لیے مطبوعات براہ راست: مدیر ترجمان القرآن منصورہ' لاہور ۵۴۵۷۰ کو بھیجی جائیں۔

مدیر کے نام

محمود فاروقی' کراچی

میری رائے ہے کہ ترجمان القرآن میں انتہائی منتخب صرف ادارتی اشتہار شائع ہوں۔ کمرشل اشتہارات بالکل نہ ہوں۔ قارئین ترجمان القرآن جیسے تحریک کے انتہائی قابل احترام رسالے پر اعتبار کر کے اشتہارات پر اعتبار کریں گے جس میں دھوکہ دہی کا احتمال بھی ہے۔ ہاں کتب یا پبلشرز کے اشتہار شائع کیے جا سکتے ہیں۔ تمام اشتہارات بالکل آخر میں دیے جائیں۔ ترجمان القرآن میں شائع ہونے والے مضامین کے موضوعات کا تعین ہونا چاہیے۔ مثلاً قرآن' حدیث' فقہ' علومِ اسلامی' پاکستانی سیاست' معیشت اور سماج کا اسلامی نقطۂ نظر سے تجزیہ۔

ذکی احمد' کراچی

آج جب میں تراویح کے بعد جہاد فنڈ کی مہم سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو بچے نے کہا "ابو! آپ نے خرم صاحب کے اشارات پڑھے؟" میں نے کہا "نہیں بیٹے ابھی وقت نہیں ملا۔" بچے نے کہا "ضرور پڑھیے اور فوراً پڑھیے کہ بہت ہی اچھے ہیں۔" میں آپ کے اشارات پڑھنے بیٹھ گیا۔ ابھی ابھی ختم ہوئے ہیں۔ اللہ آپ کو اجر دے۔ یہ وقت کی شدید ضرورت تھی کہ ارکان و کارکنان کو اطاعت کا طریقہ اور اختلاف کا طریقہ سکھائیں۔ آپ نے ایک ماہر نباض کی طرح مرض کی نشاندہی کی ہے اور علاج بھی بتایا ہے۔ ان شاء اللہ ہم ہر طرح تعاون کریں گے' بلکہ دل سے دعا بھی دیں گے۔

سید محمد عباس' پشاور

تراجم کے سلسلے میں یہ اہتمام کرنا چاہیے کہ ماخذ کا حوالہ جلی طور پر شائع ہو' تاکہ ایسے لوگوں کے لیے سہولت ہو جو اصل مضمون پڑھنا چاہتے ہیں۔

محمد حیات خان جلیل' راولپنڈی

جن مضامین کے تراجم اور تلخیص دی جائے ان کو ایک ہی شمارے میں مکمل پیش کیا جائے۔ قسطوں کی صورت میں مکمل پڑھنا رہ ہی جاتا ہے۔ عام قاری "تہذیبوں کا تصادم" یا پرنس چارلس کے خطاب سے بے بہرہ ہی رہے گا' تاوقتیکہ ایک بامقصد اور نتیجہ خیز تبصرہ ان مضامین کے آخر میں نہ ہو۔

ادریس احمد خان، کوٹلی (آزاد کشمیر)

دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق مختلف موضوعات کا شامل کیا جانا احسن تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس عظیم کارِ خیر کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ اشارات تو بہت ہی دلچسپ اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں جنھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

اکبر رحمانی، مدیر آموزگار، جلگاؤں، بھارت

ترجمان القرآن کا نیا روپ بے حد پسند آیا۔ صفحات کے بڑھ جانے سے بصیرت و ہدایت کا زیادہ سامان پیدا ہو گیا ہے۔ آپ کے اداریے ہم لوگ یہاں اجتماعی طور پر پڑھتے ہیں۔ ہر رفیق ترجمان القرآن کا بے چینی سے انتظار کرتا ہے۔

محمد عثمان انور، باغ (آزاد کشمیر)

کافی عرصے سے ترجمان القرآن پڑھ رہا ہوں۔ لیکن گزشتہ تین ماہ سے اس میں جو خوشگوار اور حیرت انگیز تبدیلی آئی ہے اس پر بے اختیار ربِ کریم کا شکر ادا کیا اور آپ کے لیے دعائیں نکلیں۔ ترجمان القرآن حقیقی معنوں میں قرآن، قرآنی دعوت، قرآنی اُسوہ، قرآنی انقلاب کا مرقع نظر آتا ہے۔

محمد آصف قریشی، ریاض

ترجمان القرآن کے کاغذ اور طباعت کا معیار بلند ہو یا نہ ہو، تزئین نو کے بعد معیار ضرور بلند ہوا ہے۔ اس کا اصل معیار تو اس کی فکری اور علمی راہنمائی کی صلاحیت ہے۔ اشتہارات کی بنیاد پر جو امیدیں اور توقعات قائم کر لی تھیں، جنوری کے شمارے میں تو وہ پوری نہیں ہوئیں، لیکن اب صورت حال بہتر ہو گئی ہے۔ ترجمان القرآن کو تحریکِ اسلامی کے مدبروں اور مفکروں کی اجتماعی کوشش کا مظہر ہونا چاہیے۔ الحمدللہ ہر شمارے میں اشارات، فکری راہنمائی کا حق ادا کرتے نظر آتے ہیں اور کسی حد تک مولاناؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہماری تحریک جس مرحلے سے گزر رہی ہے اس میں اجتماعیت، شورائیت اور ہمہ گیریت کے احساس کو پروان چڑھانا اور طاقتور کرنا اشد ضروری ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ کو تحریک کے اندر اور باہر ہر طرف سے بھرپور تعاون ملے اور یہ مجلہ نئی آب و تاب سے جاری رہے۔


وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ
اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے اور
تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند بنانے کے لیے۔
Yunas FANS
آپ کا پہلا انتخاب یونس پنکھے
پائیداری اور کارکردگی میں بے مثال مکمل گارنٹی شدہ۔ بے آواز اور خوشنما
یونس میٹل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ
4590 YUNAS PK ٹیلکس نمبر
یونس پنکھے
سالہا سال سے پسندیدہ
تربیت یافتہ ٹیکنیکی ماہرین کی
شب و روز محنت کا نتیجہ

PHONE : 7234014
7236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE